سیّد مظہر جمیل

سندھی ادب کے عہدِ جدید میں فکشن کے میلانات و رجحانات☆

(افسانہ، ناول، ڈراما)

(۱۹۴۷ تا ۱۹۹۰ء)

مختصر افسانہ

قیامِ پاکستان کے وقت تک سندھی افسانہ کم و بیش نصف صدی کا سفر طے کر چکا تھا۔ خاص طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد برپا ہونے والی اتھل پتھل اور ذہنی تناؤ سے جو صورتِ حال ابھری تھی، سندھی افسانہ نے اسے بہت حد تک اپنے آپ میں جذب کرلیا تھا۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں اَن گنت ادارے، رسائل و جرائد، اخبارات و مخزن مصروفِ عمل تھے، جو جدید سندھی فکشن کی توسیع اور مقبولیت میں گوناگوں اضافہ کررہے تھے۔ بول چند راج پال کا رسالہ 'سندھو' جو ابتدا میں شکارپور سے اور بعد میں جیکب آباد سے نکل رہا تھا اور جس میں صف اول کے افسانے نگاروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ 'سندھی ساہتہ' کے زیرِ اہتمام نکلنے والا رسالہ جو ۱۹۲۵ء سے قیامِ پاکستان تک باقاعدگی سے نکلتا رہا ہے، سندھی فکشن کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لیتا رہا ہے، اس کے علاوہ دوسرے اداروں کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے جرائد بھی سلسلہ وار ناولوں اور طویل افسانوں کی اشاعت کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان رسالوں نے طویل ناول قسط وار شائع کیے تھے۔ وہ خلیق مورائی کا رسالہ 'ترقی' اور قادر بخش نظامانی کا رسالہ 'خلافت' ہے (جس میں ابتداً جمال ابڑو اور ع ق شیخ کی کہانیاں شائع ہوئی تھیں) اس ضمن میں پیش پیش تھے۔ تھانور داس کا 'سستی کتاب سلسلہ' یا مسلم

☆ زیرِ اشاعت کتاب "جدید سندھی ادب... رجحانات و امکانات" کا ایک باب۔

Scanned by CamScanner

ادبی سوسائٹی کے اشاعتی سلسلے ہوں یا نئین سندھ لائبریری، سندھی کتاب گھر، باغی پبلی کیشن، آزاد پبلی کیشن، نئین دنیا، آشا ساہت منڈل، اور اگتی قدم پبلی کیشن وغیرہ اور نہ جانے کتنے ہی دوسرے ادارے، رسالے اور اشاعتی سلسلے تھے جو سندھ کے کم و بیش ہر شہر سے شائع ہو رہے تھے اور جن کی خصوصی توجہ سندھی افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کی اشاعت پر صرف ہو رہی تھی۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کراچی میں پچپن ادارے، حیدر آباد میں پینتیس، سکھر میں دس، شکارپور میں دس اور لاڑکانہ میں پانچ ادارے اس نوع کی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل تھے۔ انگریزی، اردو، بنگلہ اور مرہٹی زبانوں سے کہانیوں کے تراجم کا دور ابتدائی عشروں میں مکمل ہو چکا تھا اور چوتھی دہائی تک طبع زاد افسانوں کا ذوق خاصا مستحکم ہو چلا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب لوگوں میں طویل ناول پڑھنے کا چسکہ پڑ گیا تھا جو قسط وار اخبارات و رسائل یا کتابی سلسلوں میں شائع ہوا کرتے تھے جیسے لعل چند امر ڈنومل کی چوبیس اقساط پر مشتمل 'بھوت ناتھ کی جیونی' اور مکھی میرومل ساگرانی کی ناول 'ہر دل عزیز' جو اٹھائیس قسطوں میں چھپی، یا عثمان ڈیپلائی کی نیم تاریخی، نیم رومانی ناول جو سال ہا سال قسط وار شائع ہوتے تھے۔ اس عہد میں موضوعاتی اعتبار سے بھی زیادہ وسیع تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ چناں چہ اس زمانے میں رومانی افسانے اور ناول بھی لکھے جا رہے تھے، دھارمک کہانیاں بھی چھپ رہی تھیں، سنسنی خیز جاسوسی و سستی جذباتیت سے لب ریز جنسی کتابیں بھی دھڑا دھڑ شائع ہو رہی تھیں لیکن یہی وہ دور بھی ہے جس میں چند باشعور اور ترقی پسند فکر رکھنے والے فن کاروں نے سندھی افسانے کو سوشل ریئلزم یعنی سماجی حقیقت نگاری کی طرف مائل کیا تھا اور سندھی فکشن کو بے سمتی کے صحرا میں بگولے کی طرح بھٹکتے دینے کی بجائے سندھی معاشرے کی حقیقی صورتِ حال سے منسلک کر دیا تھا۔ حقیقت نگاری کے اس رجحان کے تحت ہی سندھی فکشن کی بے چہرگی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی اور اس کے اپنے نین نقش اور رنگ روپ ابھرنے لگے تھے۔ سماجی حقیقت نگاری کے حامل جدید افسانے کے ابتدائی خدمت گزاروں میں مرزا نادر بیگ، عثمان علی انصاری، امرلال ہنگورانی، آسانند مامتو رائے، گوبند مالھی، تارا چند پھٹیل، آنند گولانی، رام لعل پنجوانی، لچھمن راجپال، کیرت بابانی، پون پنجوانی جیسے لوگ شامل تھے۔ عثمان علی انصاری کے

Scanned by CamScanner

افسانوں کا مجموعہ 'گنج' ۱۹۳۷ء میں شائع ہو چکا تھا اور اس میں شامل افسانے سماجی حقیقت نگاری کے ابتدائی عکس تھے، جن میں سندھی معاشرہ سانس لیتا اور سندھی کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے، مرزا نادر بیگ کی کہانیوں کا مجموعہ 'نادر بیگ مرزا جی کہانیوں' ان کی وفات (۱۹۴۰ء) کے بعد کم و بیش ساٹھ سال کی تاخیر سے شائع ہوا تھا لیکن سماجی حقیقت نگاری کے ابتدائی دور میں مرزا نادر بیگ کی کہانیوں سے صرفِ نظر ممکن ہی نہیں۔ مرزا نادر بیگ، مرزا قلیچ بیگ کے فرزندِ ارجمند تھے، وہ ایک پڑھے لکھے اور عالمی ادب سے روشناس شخص تھے اور جدید افسانہ نگاری کے فن پر گہری نگاہ رکھتے تھے، چناں چہ ان کی کہانیوں میں سماجی مسائل اور انسانی سرگزشت کا حال تمام تر در و بست کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کا اسلوب اتنا سادہ، پُرکار اور زندگی سے قریب تر ہے کہ آج بھی دل کشی رکھتا ہے۔ اسی طرح امر لال ہنگورانی کے فنی کمال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے صرف 'ادو عبدالرحمٰن' جیسی شاہکار کہانی کا نام لے لینا کافی ہوگا۔ جو پون صدی گزر جانے کے باوجود اب بھی اتنی ہی تازہ اور موثر ہے جتنی کہ اپنے زمانۂ تخلیق میں تھی۔ تیز پرواز وقت ہے کہ اڑا جاتا ہے مگر اس دور کی بعض کہانیوں کی مقبولیت اور دل کشی میں کمی نہیں آنے پاتی۔ امر لعل ہنگورانی کی کہانی 'ادو عبدالرحمٰن' (بھائی عبدالرحمٰن) اب تک جدید افسانہ نگاروں کے لیے ایک معیار اور چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں یہ کہانی ٹہل رام اڈوانی کے مرتب کردہ انتخاب Short sotries of Indian life میں انگریزی روپ میں شامل ہوئی اور اس وقت سے اب تک متعدد عالمی انتخابات اور انتھرولوجیز (Anthrologies) میں شامل ہوتی رہی ہے۔ اسے بین الاقوامی شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب پچاس کی دہائی میں اسے یونیسکو کے زیرِ اہتمام مرتب کردہ انتھالوجی 'دنیا کی بہترین کہانیوں' میں شامل کیا گیا۔ سندھی افسانے میں امر لعل ہنگورانی کی کہانی 'ادو عبدالرحمٰن' کو وہی اہمیت اور فضیلت حاصل ہے جو اردو میں پریم چند کی کہانی 'کفن' کو حاصل ہے۔ ہر چند دونوں کہانیوں کے موضوعات اور اندازِ نگارش ایک دوسرے سے قطعی جدا ہیں۔ لیکن جس طرح 'کفن' کے تذکرے کے بغیر اردو افسانے کا جائزہ مکمل نہیں ہوتا، اسی طرح سندھی افسانے کی تاریخ میں 'ادو عبدالرحمٰن' کا ذکر ضرور قرار پاتا ہے۔ مذکورہ بالا جائزے کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ بیسویں صدی

Scanned by CamScanner

کی چوتھی دہائی کے خاتمے تک جدید سندھی افسانہ اپنے خد و خال واضح کر چکا تھا اور اس کی ایک شناخت بھی قائم ہو چلی تھی۔

قیامِ پاکستان کے آس پاس شیخ عبدالرزاق راز کے افسانے بھی سندھ کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر عوامی توجہ مبذول کر چکے تھے۔ لطف اللہ بدوی کے افسانوں کا مجموعہ 'دستۂ گل' بھی شائع ہو چکا تھا۔ ہر چند مرزا نادر بیگ ۱۹۴۰ء میں انتقال کر چکے تھے لیکن ان کے منتخب افسانوں یعنی 'موہنی جی ڈائری'، 'موہنی جے دل جی دھڑکن'، 'موہنی جی آہ'، 'پاک محبت'، 'عینک جو آواز' اور 'مس رستم جی' جیسے افسانوں کی گونج ابھی تک موجود تھی۔ پیر حسام الدین راشدی کا افسانہ 'انارکلی' اور عبداللہ عبد کا 'ماستریانی' ابھی تازہ تازہ تھے لیکن اصل دھماکا شیخ ایاز کے افسانوں کے مجموعہ 'سفید وحشی' نے کیا تھا جو ۱۹۴۷ء کے اوائل میں شائع ہوا تو حکومت وقت نے اسے فی الفور بحق سرکار ضبط کرلیا۔ اس اعتبار سے شاید شیخ ایاز پہلے ادیب تھے، جن کی تخلیقی کتاب 'بغاوت' کے الزام میں بحق سرکار ضبط ہوئی ہے۔ 'سفید وحشی' محض ایک افسانوی مجموعہ نہیں تھا بلکہ اس کی ادبی قدر و قیمت اور درجہ بندی سے قطع نظر اپنے انوکھے موضوعات اور نئے اسلوب کی بنا پر اس مجموعہ نے نئی نسل کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ لیکن اس دور میں شیخ ایاز تنہا نہ تھے بلکہ ترقی پسند لکھنے والوں کا ایک سلسلہ تھا جنھوں نے سندھی افسانے کو سماجی حقیقت نگاری کے متنوع رنگوں سے دیدہ زیب اور جاذب توجہ بنا رکھا تھا۔ ان میں گلی سدا رنگانی کی طویل کہانی (ناولٹ) 'اتحاد'، تارا میر چندانی کی کہانی 'کومل کلی'، حشو کیول رامانی کی 'پدما' شیخ عبدالستار کی 'رحیما'، آنند گولانی کی 'سنگ' اور سائیں داد سولنگی کی 'ملاقات' ایسی کہانیاں تھیں جنھوں نے سندھی افسانے کے دامن کو متعدد جان دار اور پرتاثر کہانیوں سے بھر دیا تھا... آنند گولانی، گوبند مالھی اور گوبند پنجابی اپنی اپنی جگہ نہایت اہم اور معتبر لکھنے والے تھے جن کی ادبی و تخلیقی تگ و تاز نے سندھی ادب کو بارونق بنا رکھا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان سب لوگوں کے ہجرت کر جانے کی بنا پر یہاں سے وہاں تک ایک سناٹا سا گونجنے لگا تھا۔

یوں بھی یہ زمانہ عجب افراتفری اور شکست و ریخت کا زمانہ تھا۔ سرحد کے دونوں طرف مذہب کے نام پر موت اور ہلاکت نے وہ بھیانک کھیل کھیلا تھا کہ خدا کی پناہ، لاکھوں انسان آزادی کی دیوی کے حضور بھینٹ چڑھا دیے گئے تھے اور ان گنت

Scanned by CamScanner

شکستہ دل اور دریدہ بدن قافلے تھے جو آگ اور خون کے اہلتے ہوئے وحشت آثار طوفانی دھاروں میں دھکیل دیے گئے تھے کہ جو خوش قسمت اس جہنم سے زندہ سلامت نکل آئیں گے وہ ریزہ ریزہ بکھری ہوئی زندگی کو پھر پلکوں سے سمیٹنے پر مامور کر دیے جائیں گے۔ بے شک اس ماحول میں بھلا کہاں کا ادب؟ اور کیسی ثقافت! اور بقول شخصے:

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

سندھ سے ہجرت کر جانے والوں میں سندری اتم چندانی، پروفیسر رام پنجوانی، گوبند مالھی، گوبند پنجابی، آنند گولانی، کشور، جگدیش بچھانی، برج موہن، کلا پرکاش، لعل پشپ، سگھن آہوجا، کماری پوپٹی ہیرا نندانی، امر لال ہنگورانی، نارائن شیام، جیے سنگھانی، کیرت بابانی وغیرہ جیسے ترقی پسند لوگ شامل تھے جن کے دم سے سندھ کا ادبی افق جگمگاتا تھا۔

سندھ کا شہری معاشرہ بالعموم ہندو آبادی پر مشتمل تھا اور ان لوگوں کے جاتے ہی شہر کے شہر سنسان اور خالی لگنے لگے تھے۔ تا آں کہ اس خلا کو ہندوستان سے آنے والے مہاجرین نے پُر کیا۔ شہروں میں مہاجروں کے مجتمع ہو جانے کا ایک بنیادی سبب بھی یہی رہا ہے۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ادبی محفل میں قدرے خاموشی طاری رہی تھی، جو تھوڑی بہت چہل پہل تھی بھی تو وہ شعری محفلوں تک محدود تھی جہاں فوری ردِعمل کے اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آتی ہے، اردو لکھنے اور بولنے والوں کی آمد اور اشتراکِ عمل سے مشترکہ سندھی اردو مشاعرے اور کانفرنسیں بھی منعقد ہو رہی تھیں اور ابتدا میں یوں لگتا تھا جیسے سندھ میں دو لسانی اور مخلوط تہذیبی معاشرہ وجود پانے لگا ہو لیکن آہستہ آہستہ اہلِ سیاست اور گروہی مفادات نے ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا اور شہری و دیہی معاشروں کے مابین معاملات بیگانگیت کی طرف پیش قدمی کرتے چلے گئے، جو یقیناً ایک افسوس ناک امر تھا۔ چناں چہ اس وقت بوئی گئی زہریلی فصل آنے والے عشروں میں کاٹی گئی بلکہ اہلِ سندھ اب تک اس کی زہرناکی کے صدمات جھیل رہے ہیں۔

اس عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ عبدالرزاق راز نے اپنے مضمون مختصر

Scanned by CamScanner

افسانے کا فنی جائزہ' میں لکھا تھا:

''مختصر افسانہ دراصل ترقی پسند تحریک ہی کی توسیع ہے۔ جس کے بانی گوبند مالھی، کیرت بابانی سوبھوگیان چندانی، شیخ ایاز اور رام پنجوانی وغیرہ تھے اسی تحریک کے زیر اثر 'ریگستانی پھول'، 'سفید وحشی'، 'لہریں'، 'طلوع صبح'، 'آگئے قدم' جیسے افسانوی مجموعے منظرِعام پر آئے تھے جو سندھی مختصر افسانے کے سفر میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں...''

ہندوؤں کے ترکِ وطن کر جانے کے بعد اس صنف پر جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ جسے شیخ ایاز کے مجموعہ 'پنھل کھاں پوء' (پنھل کے بعد) نے توڑا۔ اس مجموعہ میں 'پنھل کھاں پوء' نامی کہانی کے علاوہ سب افسانے وہ تھے جو شیخ ایاز کے پہلے مجموعہ 'سفید وحشی' میں شامل تھے۔

'پنھل کھاں پوء' (پنھل کے بعد) کے ساتھ ہی شیخ عبدالرزاق راز کے افسانوں کا مجموعہ 'ڈاک بنگلو' شائع ہوا اور اسی زمانے میں مقبول صدیقی (مرحوم) کی مرتب کردہ انتھالوجی 'گل اور مکھڑیوں' (پھول اور کلیاں) منظر عام پر آئی جس میں متعدد نوجوان افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل تھیں۔ شیخ ایاز کی کہانی کے مجموعے 'سفید وحشی' اور 'پنھل کھاں پوء' کے تیس پینتیس سال کے بعد ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ 'جی تند برابر توریاں' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں بعض کہانیاں پہلے دو مجموعوں ہی سے لی گئی تھیں۔ گویا اس پورے دور میں شیخ ایاز افسانہ نگاری سے دامن گریزاں رہے ہیں۔

شیخ ایاز کے منتخب افسانوں میں 'سفید وحشی'، 'کھلنی'، 'مسافر مکرانی'، 'رفیق'، 'چار ایکڑ زمین'، 'کارو رنگ' اور 'نوراں' وغیرہ عہد ساز کہانیاں تھیں۔ ان افسانوں میں زندگی کا تناظر وسیع ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ اس وقت جاری تحریکِ آزادی کی دھک بھی سنائی دیتی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اس دور کے فکشن کا ایک مرغوب موضوع تھا، چناں چہ شیخ ایاز کے افسانوں میں اس معاصرانہ رجحان کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ 'نوراں'، 'کھلنی'، 'کارو رنگ' وغیرہ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں ہیں۔ یہی وہ دور تھا جب سندھی ادب میں طبقہ وارانہ جانب داری کا رجحان بھی پیدا ہو چلا تھا۔ اور سندھ کے ترقی پسند تخلیق کار، محنت کش اور مظلوم طبقات کے ساتھ اپنی جانب داری کا اظہار کر رہے تھے۔ چنانچہ شیخ ایاز کے افسانے 'رفیق' میں مزدوروں اور

Scanned by CamScanner

محنت کشوں کے درمیان باہمی یک جہتی کا شعور اور مشترک احساسات کی ترجمانی ملتی ہے۔ لیکن ان کہانیوں میں شیخ ایاز کی کہانی 'چار ایکڑ زمین' سندھ کے دیہی معاشرت کی ناآسودہ فضا کو جس مؤثر انداز میں پینٹ (paint) کرتی ہے، اس کی مثال کم ملتی ہے، اس کہانی میں غریب کسانوں اور ہاریوں کی زمین سے وابستگی اور ان کی زندگی میں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور کھیتی باڑی کے لیے پانی کی دستیابی کی جو اہمیت بنتی ہے اور ان چیزوں کے حصول کے لیے اُن محروم لوگوں کے درمیان جیسی گھناؤنی کش مکش، دشمنیاں اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں، ان سب کو شیخ ایاز نے نہایت فن کارانہ انداز سے دکھایا ہے۔ شیخ ایاز کے افسانوں نے نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو جتنا متاثر کیا ہے، اتنا اثر نئی نسل کے لکھنے والوں نے کہیں اور سے قبول نہیں کیا ہے... اسی لیے شیخ عبدالرزاق راز اور آغا سلیم نے شیخ ایاز کو عہد ساز افسانہ نگار کہا ہے۔

اصل بات یہی ہے کہ ابتدائی برسوں کے بعد شیخ ایاز کی تخلیقی توجہ افسانے سے ہٹ کر شاعری کی گرویدہ ہو کر رہ گئی تھی اور اسی طرح عبدالرزاق راز بھی ابتدائی مجموعہ کے بعد کوئی غیر معمولی افسانہ نہ لکھ سکے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'ڈاک بنگلے' نے سندھی افسانے کے ٹھہرے ہوئے پانی کو متحرک کر دیا تھا۔ شیخ عبدالرزاق راز کے اہم افسانوں میں 'ڈاک بنگلو'، 'ناکام محبت' اور 'گریجویٹ' یادگار کہانیاں ہیں۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں کئی افسانہ نگار سامنے آئے ہیں اور سندھی رسائل و جرائد میں افسانے کے نام پر بہت کچھ شائع ہونے لگا تھا لیکن تخلیق کا جوہر قابلِ ذکر جن لوگوں کے ہاں جھلک دکھا سکا، ان میں جمال ابڑو، ایاز قادری، بشیر موریانی، ابن الیاس سومرو، دل دار حسین موسوی اور نجم عباسی کے نام اہم ہیں۔ ان میں نجم عباسی کے بعض افسانے قیامِ پاکستان سے قبل بھی شائع ہو چکے تھے۔

تقسیم سے قبل لکھنے والوں میں لطف اللہ بدوی اور محمد عثمان ڈیپلائی بھی شامل تھے۔ لطف اللہ بدوی اور عثمان ڈیپلائی خاصے زود نویس افسانہ نگار تھے، انھوں نے بہ اعتبار کمیت بہت زیادہ لکھا ہے۔ عثمان ڈیپلائی تو کمرشل ضرورتوں کے لیے یعنی اپنے ہی قائم کیے ہوئے اشاعتی سلسلے کے لیے بھی لکھتے تھے لہٰذا وہ معیار جو خود ان کی بعض

Scanned by CamScanner

تحریروں نے قائم کردیا تھا، سب کہانیوں میں قائم نہیں رکھا جاسکا تھا۔ عثمان ڈیپلائی کی نمائندہ کہانیوں میں ''گاموں جا گفتا'' (گاموں کی باتیں)، ''جیکو ماں ڈٹھو'' (جو میں نے دیکھا)، ''نرالا نظارہ'' اور ''جیل جو مشاہدو'' (جیل کا مشاہدہ) شامل ہیں۔

اسی دور میں ابراہیم خلیل شیخ (جو بنیادی طور پر شاعر تھے) کے نفسیاتی افسانوں کا مجموعہ ''عبرت کدہ'' کے نام سے بھی سامنے آتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر ابراہیم خلیل شیخ نے نفسیاتی معالج ہونے کی حیثیت سے اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہانیاں لکھی تھیں۔

اس دور کے سب سے اہم اور رجحان ساز افسانہ نگار جمال ابڑو، ایاز قادری، بشیر موریانی اور غلام ربانی آگرو ہیں کہ ان لوگوں نے نہ صرف اپنے عہد کے افسانوں کی صورت گری کی ہے بلکہ سندھی افسانے کو ایک خاص ڈگر پر ڈالا اور سماجی حقیقت نگاری کی اس روایت کو جو ان کے پیش رو ڈال گئے تھے، زیادہ بامعنی، وسیع اور متنوع بنایا ہے۔ جمال ابڑو کے افسانوں کا مجموعہ ''پسو پاشا''، ایاز قادری کا مجموعہ ''بلّو دادا'' اور غلام ربانی آگرو کی کہانی کا مجموعہ ''آبِ حیات'' کے نام سے شائع ہو چکے تھے جب کہ بشیر موریانی کی کہانیاں 'چھڑی'، 'پریم'، 'ٹیکری'، 'زندگی جو روگ' وغیرہ قبولِ عام حاصل کر چکی تھیں۔ بشیر موریانی کا حال میں شائع شدہ ایک افسانہ ''کاسبین جو کمال'' شائع ہوا تھا جو سندھی کے منتخب افسانوں میں شامل ہونے کے قابل ہے۔ ان کی کہانیوں کے دو مجموعے 'اجنبی' اور 'زندگی جی راہ پر' بہت عرصے قبل شائع ہو چکے ہیں۔

اس دور کے نمائندہ افسانوں میں ایک خاص رجحان نمایاں طور پر دیکھنے میں آتا ہے جس کی طرف آغا سلیم نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ 'نئین زندگی' کراچی (جنوری ۱۹۶۸ء) میں اشارہ کیا ہے اور وہ ہے سندھی معاشرے میں ایک نئے ابھرتے ہوئے کردار کی پیش کش۔ یہ ایک 'شریف بدمعاش' (Rouge Gentleman) کا کردار ہے جو شہری اور قصباتی معاشرے میں پیدا ہو رہا تھا اور جس کی جھلکیاں جمال ابڑو نے اپنی کہانیوں 'بدمعاش' اور 'پسو پاشا' میں، ایاز قادری نے 'بلّو دادا' میں، غلام ربانی آگرو نے 'شیدو دھاڑیل' میں دکھائی ہیں۔

یوں تو اس دور نے کئی قد آور افسانہ نگار پیدا کیے ہیں، جن میں جمال ابڑو، ایاز قادری، غلام ربانی آگرو، حمید سندھی، بشیر موریانی، حفیظ شیخ، سراج الحق میمن، مرزا

Scanned by CamScanner

مراد علی، ع ق شیخ، بیگم زینت چنہ، کروڑ پتی، علی احمد بروہی، رشید بھٹی، ثمیرہ زریں، جمال رند، خواجہ سلیم وغیرہم شامل ہیں۔ مذکورہ صاحبانِ قلم آگے پیچھے ہی افسانے کی بزم میں شامل ہوئے تھے اور ان میں سے بیش تر نے بعض ایسی لافانی کہانیاں لکھی ہیں کہ ان سب کا جدا جدا تذکرہ کیے بغیر کوئی تجزیہ مکمل نہیں کہلا سکتا۔

ہر چند جمال ابڑو کبھی بھی زود نویس فن کار نہیں رہے ہیں اور انھوں نے مقدار کے اعتبار سے بعض ہم عصروں کے مقابلے میں بہت کم لکھا ہے لیکن جتنی بھی کہانیاں انھوں نے لکھی ہیں، ان میں اکثر و بیش تر نہایت معیاری ہیں۔ ایک مدت تک نئے لکھنے والوں میں جمال ابڑو کی کہانی اور ان کے طرزِ ادائیگی کو مثالی سمجھا جاتا رہا ہے۔ جمال ابڑو کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے کہ انھوں نے سندھی افسانے کو موضوع کی کشادگی بھی دی اور تنوع بھی دیا ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے افسانے کے دامن کو سندھ کی معاشرتی معروضیت سے بھی باندھے رکھا۔ جس نے جمال ابڑو کے افسانے کو سندھی معاشرے کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ انھوں نے سندھی معاشرت کے تمام تر حسن، ساری خوبیوں اور سب محرومیوں، نا آسودگیوں اور الجھنوں کو اپنے افسانوں میں نہایت فن کارانہ طور پر گوندھ دیا ہے۔ چناں چہ سندھی معاشرت کے سب رنگ جمال ابڑو کی کہانیوں میں جھلکتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی دوسری خوبی کردار نگاری، فضا سازی اور زبان کا استعمال ہے۔ انھوں نے اپنے موضوعات بھی دیہی زندگی سے حاصل کیے ہیں۔ جمال ابڑو ایک ایسے حقیقت نگار ہیں جو حقیقت نگاری کو فنی در و بست کے تابع رکھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے مؤثر حسن کار ہیں جو اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ کون سی بات کب، کہاں اور کس طرح کہی جانی چاہیے... جمال ابڑو نے اپنی کہانیوں میں جتنے لازوال اور یادگار کردار پیش کیے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ 'پسو پاشا' اور 'بدمعاش' کے علاوہ 'خمیسو جو کوٹ' میں صرف خمیسو کا کردار ہی جان دار نہیں ہے بلکہ خمیسو کا گرم کوٹ بھی ایک زندہ کردار کے طور پر ابھرتا ہے۔ اسی طرح 'پیرانی' کا کردار سندھ کی فلاکت زدہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ کہانی 'بدتمیز' میں انسانی اقدار کی زبوں حالی کا ماتم کیا گیا ہے اور 'شاہ جو پھر' میں ذات پات اور جہالت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے معصوم لوگوں کی مجبوریوں کا احوال لکھا گیا ہے۔ 'ماں جی جھولی' میں عورت کی ممتا اور انسان سے پیار کی کہانی ہے۔ غرض ان سب

Scanned by CamScanner

کہانیوں میں جمال ابڑو زندگی کو بہت قریب سے پیش کرتے ہیں اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں واضح اور روشن ہیں، بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جمال ابڑو کی کہانیوں میں کرشن چندر کے اسلوب کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن یہ خیال بہت زیادہ درست نہیں ہے کہ جمال ابڑو کا منفرد طرزِ نگارش خالص مقامی فضا سے ابھرتا ہے۔

بشیر موریانی قیامِ پاکستان کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں اور شاعروں میں اپنی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی بنا پر خاصی مدت تک تخلیقی سرگرمیوں کو زیادہ فعال نہیں رکھ سکے تھے لیکن انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری میں جو کچھ تخلیق کیا ہے وہ منفرد اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات نہایت خوش گوار ہے کہ ایک طویل عرصے کے تعطل کے بعد ان کا قلم پھر رواں ہونے لگا ہے اور انھوں نے تلے اوپر کئی عمدہ کہانیاں لکھی ہیں۔ یوں تو ان کی کہانیاں 'ٹیکری' اور 'زندگی کا روگ' اپنے عہد کی نمائندہ کہانیاں تھیں اور ان میں سندھ کے فلاکت زدہ معاشرے کی معروضی صورتِ حال کی عکاسی ہوئی ہے۔ لیکن بشیر موریانی کی کہانی 'پریم' اپنے منفرد موضوع اور ٹریٹمنٹ کی وجہ سے نہایت مؤثر اور یاد رکھے جانے والی کہانی ہے۔ اس میں ایک ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے جسے شروع ہی سے محبت، یگانگت اور اپنائیت سے محرومی کیا جاتا رہا ہے اور زندگی کا ہر دور اس کی نفسیاتی ناآسودگیوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ انسانوں کی بھری پُری زندگی سے مایوس ہوکر بلّیوں سے جی لگا کے آسودہ خاطری حاصل کرتا ہے، یہ ایک ذہین اور صاحبِ صلاحیت کردار کے اخلاقی طور پر معدوم ہونے کی کہانی ہے۔ اس کہانی کی خوبی صرف اس کا موضوع ہی نہیں ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال اس کا مؤثر طریقِ اظہار ہے کہ بشیر موریانی نے ایک نازک موضوع کو نہایت مضبوط اور مؤثر انداز میں بیان کیا ہے اور کہانی کے ٹریٹمنٹ کو کہیں لاؤڈ (loud) نہیں ہونے دیا ہے۔

۱۹۶۰ء۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے افسانہ نگاروں میں ع۔ق۔ شیخ، ابنِ حیات پنھور، عبدالرحیم جونیجو، شیخ حفیظ، علی احمد بروہی، غلام علی کھوکھر، رشید بھٹی اور مقبول صدیقی، شمشیر الحیدری، حسینی محمد حافظ ٹھکرائی، عبدالجبار شام، نور عباسی، شیر علی خواجہ، ثمیرہ زرین،

Scanned by CamScanner

رشیدہ حجاب، بیگم زینت علی چنہ، امینہ ہالیپوٹہ، رعنا حیدر آبادی، قاضی اختر مورائی، ساقی سجاولی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان لوگوں میں سے بیش تر نے اچھی کہانیاں لکھی تھیں اور اپنے عہد کی حقیقت پسندانہ عکاسی بھی کی تھیں اور سندھی افسانے کی تعمیر میں ان لوگوں کی عملی شراکت سے صرف نظر ممکن نہیں، لیکن ان میں سے بعض لکھنے والے افسانہ نگاری سے زیادہ نبھاؤ نہ کرسکے اور بالآخر شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے لگے جیسے شمشیرالحیدری اور بعض اصحاب ادب کی دنیا ہی سے کنارہ کش ہوگئے۔

اس عہد کی نمائندہ کہانیوں میں جمال ابڑو کے افسانے 'پسو پاشا'، 'شاہ جوپھر'، 'بدمعاش' وغیرہ منفرد افسانے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جمال ابڑو جیسا پُرفن افسانہ نگار اپنے ابتدائی دور ہی میں ادبی دنیا سے کنارہ کش ہوگیا اور سندھی افسانہ نگار کی بساط کو ان جواہر پاروں سے محروم کرگیا جن کی اس سے بجاطور پر توقع کی جارہی تھی۔ جمال کا کل ادبی اثاثہ درجن ڈیڑھ درجن افسانوں سے زائد نہیں ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر افسانہ نگاری کی طرف توجہ کی ہے اور بعد 'کاروکاری' کے مسئلے پر اس کی کہانی ''سینڈ'' سامنے آئی ہے جو اس کی پچھلی کہانیوں ہی کی طرح معیاری ہے۔

ایاز قادری کی نمائندہ کہانیوں میں 'بلّو دادا'، 'ماں انسان آھیاں' اور 'جواب دار'، 'غیرت' وغیرہ اہم کہانیاں ہیں۔ غلام ربانی آگرو کی کہانی 'آبِ حیات'، 'شیرو دھاڑیل' (شیرو بدمعاش)، 'بری ھن بھنبھور' عہد ساز کہانیاں ہیں۔ اسی طرح ع ق شیخ کی کہانی 'حیدرآباد' اور پریشان انسان، 'مکومست' وغیرہ اور حفیظ شیخ کی کہانی ''اماں ماں اسکول نہ ویندس'' (اماں میں اسکول نہ جاؤں گا) نہایت مؤثر اور حقیقت پسند کہانیاں ہیں۔ حفیظ شیخ کی کہانی میں اس نے تعلیمی نظام کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ اسی طرح ''فقیر رمندارھیا'' (فقیر گھومتے رہے) بھی معرکہ کی کہانی ہے۔ اس کا مجموعہ ''ساگر جی لھرن تی'' (ساگر کی لہروں پے) بہت پہلے ہی شائع ہو چکا ہے۔ افسوس حفیظ شیخ کی ناگہانی اور بے وقت موت سے جدید افسانہ بہتر امکانات سے محروم ہوگیا ہے۔

ابنِ حیات پنھور کی کہانی ''واہ وڈیرہ'' انسانی نفسیات کے ایک نہایت دلچسپ پہلو کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ اس میں دیہی ماحول کی

اس ماحول میں وڈیرے اور اس کے کارندوں کی ملی بھگت سیاست اور غریب ہاری کی کس مپرسی کی تصویر اتاری گئی ہے۔ ابن الیاس سومرو کی کہانیوں میں 'نئوں شکار' (نیا شکار) اور 'اختیار' قابل ذکر کہانیاں ہیں۔ شمشیر الحیدری کی کہانیوں میں 'مہران کی بیٹی'، 'پورس کے ہاتھی' دلچسپ کہانیاں ہیں۔

بیگم زینت چنہ پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جو قیام پاکستان کے بعد ابھری ہیں ورنہ اس سے پہلے کے دور میں جو دو ایک ہندو خواتین کہانی کار تھیں، ہجرت کر کے ہندوستان جا چکی تھیں اور بزم افسانہ میں خواتین کی نمائندگی باقی نہ رہی تھی۔ اس کمی کو بیگم زینت چنہ نے نہایت خوش اسلوبی سے پر کیا ہے۔ وہ اپنے فن کی ایسی بلندی پر ہیں کہ ان کے افسانوں کو زنانہ اور مردانہ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا کیوں کہ وہ اپنی قوتِ مشاہدہ اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے اس اعلیٰ درجے پر فائز ہیں جو کسی بھی باصلاحیت فن کار کی منزل ہوسکتی ہے۔ وہ بے شک زود نویس کہانی کار نہ تھیں لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں سے بیش تر کہانیاں اچھی اور قابل انتخاب رہی ہیں بلکہ ان کی کہانی 'مٹھی' (پیار، چمی)، 'اوندھی' (کالی آندھی) اور 'راندیکو' (تماشا، کھیل) اپنے عہد کی نمائندہ کہانیوں میں شامل ہیں۔

اسی دور میں علی احمد بروہی، محمد حسین کروڑ پتی، رشید بھٹی اور عثمان چھلگری طنز و مزاح کے گل زار کھلاتے رہے ہیں۔ علی احمد بروہی بنیادی طور پر صحافی رہے ہیں، چناں چہ انھوں نے اپنی طنزیہ مزاحیہ تحریروں سے سندھ کے اخبارات و رسائل کو عام عمر ثروت مند بنائے رکھا تھا اس دوراں انھوں نے بعض فرضی ناموں سے بھی لکھا ہے لیکن ان کی طنزیہ مزاحیہ تحریریں جو افسانہ کے ذیل میں رکھی جاسکتی ہوں بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں وہ منتخب ہیں۔ علی احمد بروہی کا افسانہ کردار سازی اور ماحول کی حقیقت پسندانہ عکاسی سے پیدا ہوتا ہے۔ ''چاچی جیونی'' کا کردار ایسے ہی کرداروں میں شامل ہے۔ ان کی کہانی ''عثمان حجام کا روزہ''... ایک بے مثال طنزیہ کہانی ہے جو ہمارے معاشرے کے تاریک گوشوں میں چھپی حقیقتوں کو آشکارا کرتی ہے۔

رشید بھٹی بھی اپنے عہد کے نہایت اہم اور بڑے طنز نگار تھے، وہ بھی اپنی بے وقت جوان مرگی سے سندھی افسانے کے امکانات کو ماند کر گئے ہیں۔ اگرچہ رشید بھٹی

Scanned by CamScanner

نے قیامِ پاکستان کے بعد ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور پانچویں دہائی میں وہ ایک ذمہ دار اور اہم طنز نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے، ان کے افسانے اس دور میں ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر اپنی داد بھی حاصل کر چکے تھے، ان کے افسانہ کا مجموعہ ''گھڑی گھڑی ھک گھاؤ'' (گھڑی گھڑی ایک گھاؤ) انیس سو ساٹھ میں شائع ہوا تھا جس میں شامل کہانیاں ان کے بہتر مستقبل کی نشان دہی کر رہی تھیں لیکن زندگی نے مہلت ہی نہ دی کہ وہ سندھی افسانے کے دامن کو اپنی تخلیقات سے مزید سنوارتے۔ رشید بھٹی کی منتخب کہانیوں میں 'خداداد'، 'میرل'، 'پاچھوکڑ' (جزرس)، 'ھک رپے جو نوٹ' (ایک روپے کا نوٹ) اور 'اوسیڑو' (انتظار) وغیرہ شامل ہیں۔

پانچویں اور چھٹی دہائی کے دوران سندھی افسانے نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے تازہ دم لکھنے والوں کے گروہ در گروہ افسانہ نگاری کی محفل میں داخل ہوئے ہیں۔ افسانہ نگاری اس دور کی مقبول ترین صنف تھی۔ سندھی افسانے کی ترقی و توسیع میں ہر دور میں ادبی و نیم ادبی رسائل و جرائد اور کتابی سلسلوں نے اہم کردار ادا کیے ہیں، کیوں کہ یہی وہ ذرائع ہیں جن سے ترسیلِ ادب ممکن ہوتی ہے۔ یعنی ادبی تخلیقات کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہی تخلیق کی شمع کو روشن رکھتی ہے۔ ورنہ اس کے روشن رہنے کا جواز ہی نہیں رہتا، چناں چہ اس دور میں بھی کئی نئے اور تازہ ادبی و نیم ادبی اخبارات، رسالے اور کتابی سلسلے جاری ہوتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں کراچی سے میر قادر بخش نظامانی نے ہفت روزہ رسالہ 'خلافت' نکالا تھا، جس میں جمال ابڑو اور ع۔ق شیخ وغیرہ کی اہم کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۵۱ء میں خاں بہادر محمد صدیق میمن کی زیرِ نگرانی حیدرآباد سے 'سندھی ادبی رسالو' شائع ہوا تھا۔ کراچی سے 'نئیں زندگی' اور حیدرآباد سے سہ ماہی رسالہ 'مھران' اور ماہنامہ 'سوہنی' کی اشاعت جدید سندھی ادب کی تاریخ کے اہم واقعات تھے، ان رسالوں نے اپنی اپنی جگہ سندھی ادب کی نہایت گراں قدر خدمات ادا کی ہیں۔ خاص طور پر سہ ماہی رسالے ''مھران'' نے سندھی ادب کی ترقی و توسیع میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کا ذکر کیے بغیر جدید سندھی ادب کا کوئی جائزہ مکمل نہیں ہوسکتا کہ اس رسالے میں کسی ادبی تخلیق کا شائع ہو جانا ہی اس بات کی ضمانت تھی کہ وہ تخلیق ادبی

Scanned by CamScanner

معیار پر پورا اترتی ہے۔ اس سلسلے میں جناب ابراہیم جویو کی خدمات سنہری الفاظ میں لکھی جاتی رہیں گی کہ انھوں نے نہ صرف سندھی ادب کی ترقی و ترویج میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں بلکہ نئی نسلوں میں ادب کا صحیح ذوق بھی پیدا کیا ہے اور تازہ واردانِ ادب میں چھپے ہوئے تخلیقی جوہر کو تلاش کیا ہے جو بجائے خود عہد ساز فریضہ تھا۔

اس زمانے میں حیدرآباد سے نکلنے والے رسالوں میں ماہوار 'روحِ ادب'، ماہنامہ 'فلمی دنیا'، سہ ماہی 'شاعر'، 'پرہ پھٹی'، 'ماروی' اور 'ہلالِ پاکستان' اور 'عبرت' کے ماہانہ ایڈیشنوں نے سندھی افسانے کی ترقی و توسیع میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔ اس ضمن میں سکھر سے جاری ہونے والے ماہوار تقاضا، اگنی قدم ہالا کے ماہنامہ فردوس، نواب شاہ کے ماہ وار رسالے 'ادا'، 'آئینہ' اور 'رہنما'، دادو کے 'اسان جی منزل' وغیرہ ایسے رسالے ہیں، جن کی بروقت اشاعت نے جدید سندھی ادب بالخصوص سندھی افسانے کے فروغ میں اہم کردار انجام دیے ہیں۔ ان رسائل و جرائد میں بہت معیاری، کم معیاری اور غیر معیاری کہانیاں بھی شائع ہوتی رہی ہیں لیکن کسی بھی عہد کی ادبی قدر و قیمت اس دور میں چھپنے والے رطب و یابس سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس ڈھیر میں چمکتے ہوئے جوہر پارے ہی اپنے عہد کی اقدار کا تعین کرتے ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ مذکورہ بالا سطور میں کیا جا چکا ہے۔

یہاں ایک لمحے کو رک کر قیامِ پاکستان کی ابتدائی دہائیوں میں لکھے گئے افسانوں پر ایک نگاہ ڈال لی جائے تو اس دور کی افسانوی تخلیقات میں ہمیں مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آئیں گی:

(۱) اس عہد کا افسانہ بتاتا ہے کہ وہ اب گھٹنے گھٹنے رینگنے کی بجائے ہمک کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا ہے اور ہمت کر کے اکا دکا قدم بھی بڑھانے لگا ہے۔ گویا اس کا عہد طفولیت رخصت ہوا اور اب وہ ایک ذمہ دار صنف کی خصائص اختیار کرنے لگا ہے۔

(۲) سندھی افسانہ زیادہ تر معاشی برائیوں، بری رسموں اور جاگیرداری نظام کی خرابیوں وغیرہ تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ وہ انسانی رشتوں کی کہانی بھی سنانے لگا تھا۔

(۳) سندھی افسانے نے اپنے رشتے سندھی معاشرے اور ماحول سے مکمل طور

Scanned by CamScanner

پر استوار کر لیے تھے اور اب وہ پوری طرح سماجی حقیقت نگاری کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں محض تخیلاتی کہانی جس کا رشتہ زمینی حقائق سے نہ جڑا ہو، لکھنے کا رجحان مقبول نہ رہا تھا۔

(۴) موضوعاتی تنوع سے سندھی افسانے میں رنگ برنگ دھنک پیدا ہو چلی تھی اور گنے چنے چند موضوعات جو تقسیم سے پہلے کے افسانے میں نظر آتے تھے۔ اب بہت سے نئے موضوعات میں دب کر رہ گئے تھے۔ جیسے جیسے افسانہ نگار نے اپنے مشاہدے اور وژن (Vision) کو وسعت دی۔ اسی تناسب سے سندھی افسانے میں موضوعاتی پھیلاؤ بھی پیدا ہوتا چلا گیا ہے۔

(۵) افسانہ نگار معاشرتی واردات اور انسان کے انفرادی تجربے کو مختلف انداز، زاویے اور زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھنے لگا تھا۔ چناں چہ اس کی پیشکش نسبتاً زیادہ تہہ دار اور معنی آفریں ہو گئی تھی۔

(۵) سندھی قومیتی تحریک اور سندھی قومیت کے شعور کو عام کرنے کے لیے ایسی کہانیاں لکھی گئیں جس سے قومی افتخار اور قدیم سندھی ورثے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہو۔

(۶) سندھی ادب کے بعض سینئر افسانہ نگار افسانے کی دنیا سے عملاً دور ہو گئے، مثلاً شیخ ایاز، شیخ عبدالرزاق راز، جمال ابڑو، ایاز قادری وغیرہ۔ چناں چہ دوسری صف میں شامل بہت سے افسانہ نگاروں نے اس خلا کو پورا کیا اور اپنے کمال فن سے صفِ اوّل کو توقیر بخشی۔

(۷) اس زمانے کی بعض تخلیقات پر چند تنگ نظر ناقدین نے انگریزی اور اردو کی کہانیوں سے چربہ سازی کا الزام بھی لگایا ہے جو نہ صرف درست نہیں، بلکہ گمراہ کن بھی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس عہد کے لکھنے والے اپنے خول میں بند نہیں تھے بلکہ وہ عالمی تناظر کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور عالمی ادب سے بھی شناسائی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی اور اردو افسانے کا مطالعہ بھی ان کی شخصیت کی تعمیر میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کر رہا ہوگا اور اس مطالعے نے ان میں وسعت فکر اور اسلوب کی رنگا رنگی پیدا کی ہوگی، لہٰذا ایک زبان و ادب کا دوسری زبانوں کے ادب سے متاثر ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ متاثر ہونے اور چربہ سازی میں زمین و آسمان کا فرق ہوا

Scanned by CamScanner

کرتا ہے۔

(۸) مغربی زبانوں کے افسانوی ادب کے نمایاں رجحانات اور لکھنے والوں مثلاً ایڈگر ایلن پو، گوگول، چیخوف، موپساں وغیرہ اور اردو کے افسانہ نگار پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، عصمت چغتائی، منٹو، خواجہ احمد عباس وغیرہ کے تراجم بھی کثرت سے ہوئے اور ان کے اثرات بھی کسی نہ کسی حد تک قبول کیے گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد سندھی افسانے کا دوسرا دور انیس سو ساٹھ کے آس پاس شروع ہوتا ہے اور سن انیس سو بہتر تہتر تک جاری رہتا ہے۔ ادب میں تبدیلیاں اچانک پیدا نہیں ہوتی ہیں اور نہ اچانک ختم ہوتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں دراصل رجحانات، تصورات اور خیالات کی تبدیلیوں میں ظہور پاتی ہیں اور رجحانات و خیالات نہ تو کلینڈر کے حساب سے شروع ہوتے ہیں اور ڈائری دیکھ کر ختم ہوا کرتے ہیں۔ چناں چہ سندھی افسانے کی تبدیلی بھی دراصل بعض ظاہر و باطنی تبدیلیوں کی صورت ہی میں اجاگر ہوئی ہیں۔ نئے لکھنے والے اپنے ساتھ نئے نئے اسٹائل اور نئے نئے انداز فکر بھی لے کر آئے تھے۔

یہ دور معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت پرشور اور ہنگامہ خیز دور تھا۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھی قومی تحریک شروع ہو چکی ہے، جس کے پیشِ نظر ایک طرف ون یونٹ کے ظالمانہ وجود سے نجات حاصل کر کے صوبہ سندھ کی جغرافیائی اور انتظامی حیثیت بحال کرانا تھا اور دوسری طرف سندھی قومیت کے تشخص کو درست تاریخی تناظر میں دریافت کرنا تھا۔ قدیم تاریخی و ثقافتی ورثے کو محفوظ بنانا اور سندھ کے ذرائع پیداوار اور بے بہا وسائل کو استحصالی قوتوں سے محفوظ کرنا بھی تھا، لیکن ان سب سے بڑھ کر سندھی قومی تحریک نے سندھی عوام میں تاریخی شعور پیدا کرنے اور انھیں اپنے جائز جمہوری و معاشی حقوق اور انصاف کے حصول کے لیے تیار کرنے کو اپنا اوّلین منصب قرار دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے امور تو وہ تھے جن کا تعلق سیاسی سرگرمیوں سے تھا لہٰذا جیے سندھ تحریک، سندھی عوامی تحریک اور سندھ محاذ جیسی سیاسی جماعتیں اور گروپ ان مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل تھے، سندھی ادیب کا کام ان سے ذرا مختلف اور کہیں زیادہ مشکل تھا کہ اس نے ادب کے دائرہ کار میں رہ کر اس قومی تحریک میں حصہ بٹانا تھا اور سندھی عوام کی ذہنی، اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ان کی تربیت

Scanned by CamScanner

کرنی تھی۔ چناں چہ اس دور کے لکھنے والوں کی ذمہ داریاں اپنے پیش روؤں سے کہیں زیادہ تھیں۔

یہ دور سندھ کا انقلابی دور تھا اور سندھی قوم ایک ہمہ جہت انقلاب سے دوچار تھی۔ اس انقلاب میں سندھی ادب نے سندھی عوام کی ذہنی و جذباتی تعمیر و تہذیب میں نہایت گراں قدر حصہ بٹایا ہے اور سندھی ادب کو نہ صرف ارضی معروضیت سے ہم کنار کیے رکھا ہے بلکہ اسے زندگی کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے کا سلیقہ بھی سکھایا ہے۔

یوں تو سندھی ادبی سنگت ۱۹۵۶ء میں قائم ہو چکی تھی اور اس کے بنیادی اراکین میں ابراہیم جویو، سوبھوگیان چند، نور الدین سرکی، رشید بھٹی، تنویر عباسی، ایاز قادری، مقبول صدیقی، مقبول بھٹی وغیرہ شامل تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس ادبی و فکری تحریک نے پورے سندھ میں اپنا مضبوط حلقۂ اثر قائم کر لیا تھا۔ سندھی ادبی سنگت نے سندھی عوام میں سندھ کی تہذیب، سندھی ثقافت، سندھی ادب اور سندھی بولی سے والہانہ لگاؤ پیدا کرنے کی جس طرح سے کامیاب مہم چلائی ہے، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ بے شک سن انیس سو ساٹھ (۱۹۶۰ء) کے بعد کی دہائی میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے اور اس دور میں جذبات کی جو تیز آندھی چل رہی تھی اسے قابو میں رکھنا اور سندھی ادب کو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کا کام اگلے تمام کارناموں سے زیادہ مشکل بھی تھا اور اہم بھی۔

اس دور میں جو رسالے نکلے اور جو ادبی و اشاعتی ادارے وجود میں آئے ان میں سرفہرست حمید سندھی کا ''روح رھان'' تھا۔ جس نے اس عہد میں پیدا ہونے والی ادبی لہر کو اپنے آپ میں جذب کیا ہے اور ترقی پسندانہ فکر و نظر کی توسیع و استحکام میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''مھران'' اور ''نئین زندگی'' پہلے ہی سے نکل رہے تھے۔ ''بادل'' غالباً اسی عہد میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ رسول بخش پلیجو کے رسالے ''تحریک'' کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ رسالے دراصل اپنی سرشت میں عہد ساز اور رجحان ساز تھے، چناں چہ رسول بخش پلیجو کے رسالے میں کئی ایسے نظریاتی مضامین شائع ہوئے اور کتنے ہی کے فکری مباحث قائم ہوئے جنھوں نے اس دور کی سمت متعین کرنے میں نہایت موثر

Scanned by CamScanner

اس دور کے اہم لکھنے والوں میں سراج الحق میمن ، امر جلیل، حمید سندھی، آغا سلیم، طارق اشرف، نسیم کھرل، ثمیرہ زریں، مہتاب محبوب، غلام نبی مغل، عبدالحق عالمانی، عبدالقادر جونیجو، نجم عباسی، علی بابا، منیر احمد مانک، مشتاق باگائی، شوکت حسین شورو، رسول بخش پلیجو، عبدالرحیم جونیجو، نور الہدیٰ شاہ، رشیدہ حجاب ، بیدل سرور، عبدالجبار جونیجو، زیب بھٹی، نور عباسی، قمر شاہباز، ناصر مورائی، جمال رند، خواجہ سلیم، غالب لطیف، الطاف شیخ، عنایت جونیجو، اللہ حاجو لغاری، طارق عالم، ایاز بلوچ، نظیر شیخ، قاضی خادم، ذوالفقار، راشدی، ہدایت پریم، غلام علی عاریانی، نسیم ٹھیبو، قمر واحد، ظہور احمد، اقبال جتوئی، اور ظفر حسن وغیرہ تھے، ان میں سینئر نسل کے بھی بہت سے فن کار تھے۔ جو اس دور میں بھی مسلسل دادِ سخن دے رہے تھے۔ چناں چہ ان کے نام گنوانے سے عمداً احتراز کیا جارہا ہے۔ مذکورہ بالا لوگوں میں بعض افسانہ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے گزشتہ دہائی میں لکھنا شروع کردیا تھا لیکن ان کی شاہ کار کہانیاں اسی عہد میں سامنے آئی ہیں، اس عہد میں بعض یادگار ناول بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان کا تذکرہ مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

مذکورہ بالا دور میں افسانوں کے جو عہد ساز مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں سراج الحق میمن کا مجموعہ ''اے درد ھلے آ'' (اے درد چلے آ) ثمیرہ زریں کا 'گیت اجائل مورن جاء' (پیاسے موروں کے گیت)، حمید سندھی کا مجموعہ 'اداس وادیوں (اداس وادیاں)، اور 'سیلی سیمی'، آغا سلیم کا طویل افسانہ یا ناولٹ 'روشنی جی تلاش' طارق اشرف کا مجموعہ 'سونھن پتھر و پیار'، 'زندگی جو تنھا مسافر'، نسیم مہتاب کا مجموعہ 'تلاش' نسیم کھرل کا مجموعہ 'شبنم شبنم کنول کنول' اور 'چونتیسواں در'، امر جلیل کا مجموعہ 'دل جی دنیا'، 'جڈھیں ماں نہ ھوندس' (جب میں نہ رہوں گا)، عبدالقادر جونیجو کا 'وائیوں اور راتیوں' اور مہتاب محبوب، 'پرھ کھاں پھریں'، (صبح سے پہلے) غلام علی مغل کی کتاب 'نئوں شہر'، 'رات جانی' اور 'رات منجھی روح میں' (رات میری روح میں)، عبدالحق عالمانی 'کاروکارو کارونیاں'، نجم عباسی کے مجموعے ''طوفاں جی تمنا'، 'پتھر تی لکھیو' (پتھر پہ لکیر)، 'گاڑھو لالٹین' (سرخ قندیل) وغیرہ عہد ساز مجموعے ہیں۔ جو نہ صرف اپنے زمانے کے نمایاں رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ جنھوں نے اپنے عہد کے رجحانات کے رُخ متعین بھی کیے ہیں۔ چناں چہ ان میں سے بعض کو ٹرینڈ سیٹر (Trend Setter) قیاس کیا جائے گا۔

Scanned by CamScanner

اس دور کی یادگار تخلیقات میں سراج الحق میمن کی کہانی 'ای درد ھلی آ' (اے درد چلے آ) نجم عباسی کی 'باہر وارو' اور 'یہ خبروں' ثمیرہ زریں کی کہانیوں میں 'گیت اچائل مورن جاء' (موروں کے فضول گیت)، 'رمندا بادل' (آوارہ بادل)، 'کھجور جو ون' (کھجور کا درخت)، 'شمع بارسندی شب' (شمع جلاتی شب) وغیرہ یادگار کہانیاں ہیں۔ نسیم کھرل نے بہت کم لکھا کہ ان کی جواں مرگی سے سندھی افسانے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے لیکن نسیم کھرل کے ادبی ترکے میں بیش تر منتخب کہانیاں ہیں۔ جو ان کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ نسیم کھرل کی کہانیاں بلاشبہ جدید سندھی افسانے کا نہایت قابلِ فخر سرمایہ ہیں، اور سندھی افسانے کے تبدیل ہوتے ہوئے تناظر کی شہادت فراہم کرتے ہیں۔

امر جلیل زود نویس مگر خلاق لکھاری ہیں اور اب تک ان کی کئی درجن کتابیں سامنے آچکی ہیں لیکن اس دور میں (۷۵-۱۹۶۰ء) ان کی یادگار تصنیف ''جڈھن مان نہ ھوندس'' (جب میں نہ رہوں گا) کئی اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس پر رائٹرز گلڈ کا انعام بھی حاصل ہو چکا ہے، اس سے قبل 'دل جی دنیا' بھی انعام یافتہ کتاب ہے۔ ''تیون وجود'' (تیسرا وجود)، 'تاریخ جو کفن'، 'منجھو ڈس آسمان سا پوچھو' (میرے دکھ آسمان سے پوچھو)، 'سندھو منجھی ساہ میں' (سندھ میری روح میں)، 'رانی کوٹ جو خزانو'، 'توں جی موں جی گالھیوں' (تیری میری باتیں)، 'ھن جا رمیں' (اس حیات میں)، 'آدم جی ماں' وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو بعد کے عشرے میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن ان میں شامل بعض کہانیاں مذکورہ دور میں بھی چھپ چکی تھیں۔ ان کتابوں کے کئی کئی انڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ بلاشبہ امر جلیل سندھی کے bestseller ادیب ہیں۔

آغا سلیم کی کتاب ''چند جا تمنائی'' ۶۲-۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی تھی، اس کے بعد وہ طویل افسانوں، ناولٹ اور ناول نگاری میں زیادہ مصروف رہے ہیں اور بالآخر ناول نگاری ہی ان کی شناخت بن چکی ہے، آغا سلیم نے سندھی فکشن میں بعض نئے موضوعات بھی متعارف کیے ہیں۔ جیسے ٹوٹتے ہوئے معاشرے میں فرد کی کہانی کا ماجرا یا انسان کا وجودی مسئلہ وغیرہ لیکن انھوں نے ان مسائل کو زمینی حقائق سے منسلک کر کے ان کی ڈائمنشن (Dimension) تبدیل کردی ہے۔ حقیقت نگاری کو رومانیت سے آمیز کر کے انھوں نے ایک زیادہ پرکشش اسلوب پیش کیا ہے۔ آغا سلیم سندھی قومی تشخص کا

Scanned by CamScanner

سندھ کی تہذیبی قدروں ہی کے حوالے سے نمایاں کرتے ہیں اور اس باب میں ان کے ہاں وہ سطحی پن اور جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا جو بعض پرجوش لکھنے والے قوم پرستوں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

غلام نبی مغل کی مرکتہ الارا کہانی ''شیشہ جو گھر'' ساٹھ کی دہائی کی منتخب کہانی تھی، جس نے غلام نبی مغل کو راتوں رات شہرت عام دلوا دی تھی۔ اس کہانی کے علاوہ 'نوں شہر'، 'راز جا نیئن' (رات کا کنوار پن) اور 'رات موں جی روح' (رات میری روح) میں وقفے وقفے سے شائع ہو کر وسیع حلقے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ غلام نبی مغل صاحب طرز ادیب ہیں جنھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو ان سے قبل ایک رجحان کی حیثیت سے نہ آسکے تھے۔ غلام نبی مغل نے جنس جیسے نازک مسئلے پر نہایت احتیاط اور فن کارانہ انداز میں بہت خوب صورت کہانیاں لکھی ہیں۔

عبدالرحیم جونیجو کی کہانیوں میں 'مائی متاں'، 'ادائی بہار' (آدھی بہار)، 'خاں بہادر خیر صلاح'، 'اھڑوبی آھن (ایسے بھی ہیں)، 'بوڑ لائے بھیرو'، 'گالھ بے خود' اور 'بے دم جی' (بے خود اور بے دم کی باتیں) نہایت مؤثر اور پسندیدہ کہانیاں تھیں۔

ماہتاب محبوب کا پہلا مجموعہ 'چاندنی جوں تارون' ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جسے رائٹرز گلڈ کی طرف سے سال کی بہترین کتاب کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دوسرا مجموعہ 'پرھ کھاں پھریں' (پو پھٹنے سے پہلے) کافی دنوں بعد شائع ہوا ہے۔ ماہتاب محبوب ۱۹۶۰ء سے سرگرم رہی ہیں اور یکے بعد دیگرے متعدد اچھی کہانیاں لکھتی رہی ہیں۔ وہ سینئر صاحب طرز اور مستحکم لکھنے والی ادیبہ شمار ہوتی ہیں، وہ ابتدا میں ماہتاب منور عباسی کے نام سے بھی لکھتی رہی ہیں۔ ان کی منتخب کہانیوں میں 'جیئن کھان جیڈیوں' (حیات گریزاں)، 'موہنی موکی'، 'مٹھو بھت' (میٹھے چاول)، 'بھوک جا چک' اور 'پون پھرندی' وغیرہ شامل ہیں۔

حمید سندھی اپنی نوع کے منفرد فن کار ہیں، ان کی کہانیوں میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع ملتا ہے۔ ان کی پسندیدہ کہانیوں میں 'راندیکو' (کھیل تماشا)، 'کارورت' (کالا خون)، 'یادن جی جزیرہ میں' (یادوں کے جزیرے میں)، 'ھک خواب ھک حقیقت' اور 'واچوڑن میں لات' (شعلۂ گرد باد) وغیرہ شامل ہیں۔ حمید سندھی بھی جدید افسانے کے

Scanned by CamScanner

صفِ اوّل کے تخلیق کار ہیں۔ ان کا ادبی سفر کم و بیش پچاس سال پہ محیط ہے۔ وہ دیہی و شہری معاشروں کی منقلب صورتِ حال کے افسانہ نگار ہیں۔ چناں چہ ان کے افسانوں میں نئے شہری معاشرے کے مسائل بھی ہیں اور اس دیہات کے قصے بھی جو شہری زندگی کے تیز رفتار دھارے کی زد میں آتا جا رہا ہے۔

رسول بخش پلیجو کی اصل شناخت ایک مفکر، انقلابی، دانش ور اور تنقید نگار کی ہے، وہ سیاست کے مردِ میداں بھی ہیں اور سندھی عوام کے انسانی و جمہوری حقوق کے حصول کی راہ میں ہمہ وقت مصروفِ جہاد بھی رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں لیکن ان کی ذات میں تخلیقی شعلہ بھی بھڑکتا رہا ہے، چناں چہ انھوں نے بعض نہایت پرتاثر کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں 'ٹِسی گاڑھا گل' (کیکٹس کا لال پھول)، 'جتی باھ بھری ودیو ھنئین تہ وبھ' (جہاں آگ لگے وہیں داغ پڑے) اور 'اج آ گویا آیا' (آج لوہار آئے)، 'کارنجھر کوڑ' (کارنجھر کی لہر)، 'روکیل لوک' (روکتے آنسو) 'عبدالحق عالمانی کی لھندڑ سج جا پاچا' (ڈوبتے سورج کا سایہ)، 'کارو کارو نبھار' (سیاہ ہی سیاہ) وغیرہ اہم کہانیاں ہیں۔ سندھی افسانہ اس ہونہار فن کار کی جواں مرگی پہ ماتم گسار رہا ہے۔

خواتین افسانہ نگاروں میں رشیدہ حجاب کی اہمیت بھی مسلّمہ رہی ہے۔ وہ مہتاب محبوب اور ثمیرہ زرین کی ہم عصر ادیبہ ہیں اور انھیں کی طرح شہری معاشرے کے درمیانے طبقے کے گھر آنگن کی کہانی لکھتی ہیں۔ انھوں نے کم کم لکھا ہے لیکن وہ بہت سوچ سمجھ کر لکھنے کی قائل ہیں، ان کی کہانیوں میں فکری سطح بلند رہتی ہے۔ ان کی لکھی ہوئی 'رہزن'، 'چاند، چور، تارا اور ٹھگ' عمدہ کہانیاں ہیں۔

اسی عہد میں قمر شاہباز کی کہانیاں بھی ایسی ہیں جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ قمر شاہباز ایک ایسے حقیقت نگار ادیب ہیں جو اردگرد گزرتے ہوئے روزمرہ واقعات میں چھپی ہوئی کہانیاں اور افسانے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ معاشرتی ڈھانچے میں مضحکہ خیز صورتِ حال comic situation اور ڈسٹارشن (Destortion) کو سلیقے سے اجاگر کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اسلوبِ نگارش میں زہر خند کی چبھن محسوس کی جاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

ناصر مورائی کی کہانی 'موہن جو دڑو جو خزانو (موہن جو دڑو کا خزانہ) اور 'کارو چند' (کالا چاند) بھی اپنے عہد کی یادگار کہانیاں ہیں۔ ناصر مورائی اپنے عہد کو تاریخ کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کے خواہش مند ہیں۔

اس عہد کا تذکرہ منیر احمد مانک سندھی کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ مانک اپنے ابتدائی دور میں حقیقت نگار اور ترقی پسندانہ رجحانات کے حامل ادیب تھے اور منطقی بیانیہ اسلوب میں ترقی پسندانہ افسانے کے رجحانات کو آگے بڑھاتے رہے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان پر جدیدیت کی تحریک کے اثرات نمایاں ہوتے چلے گئے اور انھوں نے علامتی و اشاراتی اندازِ نگارش اختیار کرنا شروع کیا۔ جہاں تک زندگی کے مسائل اور انسانی مصائب کا تعلق ہے، وہ اپنے آپ کو زمینی حقائق اور ارضی معروضیت سے مربوط رکھتے چلے آئے ہیں بلکہ انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ گہرائی کے ساتھ سندھی ماحول، مقامیت اور مسائل پر خوب صورت افسانے لکھے ہیں۔ علامتی اندازِ نگارش نے ان کے فن میں تہہ داری پیدا کی ہے۔ وہ سندھ میں جدیدیت کی تحریک کے سب سے کامیاب، مقبول اور ہنرمند فن کار تھے۔ انھوں نے براہِ راست معاشرتی مسائل کی بجائے زیادہ معاشرے میں شکست و ریخت سے ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے فرد کے مسائل پر توجہ دی تھی۔ سندھ کی قومی تحریک میں بھی انھوں نے نہایت اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے اور قومی مسائل پر بھی خوب صورت کہانیاں لکھی ہیں۔ منیر احمد مانک نے بہت کم مدت میں سندھی افسانے کو ثروت مند بنانے میں غیر معمولی حصہ بٹایا ہے اور سندھی افسانے کو نئے نئے موضوعات اور اندازِ نگارش عطا کیے ہیں، لیکن یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ یہ ذہین، ہنرمند تخلیق کار عین عالمِ شباب میں خودکشی کرکے سندھی افسانے کو ویران کرگیا۔

عبدالقادر جونیجو کی کہانیاں 'کڑیل تارا' (جگمگاتے تارے)، 'واٹوں' (راستے) 'راتیوں اور رول' (رات اور مٹرگشت)، 'کانجھر کور (کانجھر کی لہر)، روکیل لڑک (روکے ہوئے آنسو)، 'زال ذات' (عورت ذات)، 'ہورو' وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جو اپنی جدگانہ بو باس اور مختلف خدوخال رکھتی ہیں۔ عبدالقادر جونیجو ایک علاحدہ مزاج اور انداز کے فن کار ہیں۔ وہ معمولی معمولی باتوں سے غیر معمولی کہانیاں تراش لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کہانیوں میں ارضی معروضیت اور زمینی وابستگی بہت گہری محسوس ہوتی ہے۔

Scanned by CamScanner

طارق اشرف بھی جدید افسانے میں اپنی جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ''سوہنی'' رسالے اور ''ادب نو'' جیسے اداروں کے ذریعے جدید سندھی ادب خصوصاً سندھی افسانے کی ترقی، توسیع اور ترویج کے لیے بہت کام کیا ہے لیکن ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے بھی وہ منفرد مقام رکھتے ہیں۔

طارق اشرف کی کہانیوں میں 'زندگی جو تنہا مسافر' (زندگی کا تنہا مسافر)، 'سونھن، پتھر اور پیار (سونا، پتھر اور پیار)، 'سنہری شام'، 'موٹی آئی یاد' (یاد پلٹ آئی)، 'ہوا کے کیر روکے' (ہوا کو کون روکے)، 'پیار جی سرحد' (پیار کی سرحد)، 'جھری پئی چندڑی' (تار تار چادر) وغیرہ ان کی ایسی کہانیاں ہیں جو سندھی افسانے کے نمائندہ انتخابات میں شریک ہوتی رہی ہیں۔ طارق اشرف سبک انداز میں لکھنے والے فن کار ہیں، ان کا اسلوب آہستہ رو اور دھیمے سُروں سے ابھرتا ہے۔ وہ گہرے مشاہدے اور عصری معروضیت سے مکمل وابستگی کے باوجود بلند آہنگ نہیں ہوتے، وہ کرداروں کو نفسیاتی اور محسوساتی سطح پر پیش کرتے ہیں اور واقعات کے اکہرے بیان کی بجائے ان کے پس منظر کو ابھارتے ہیں۔

اس عہد کے افسانوں کے اہم خصائص درجِ ذیل ہیں:

۱۔ اس عہد میں تخلیقی سطح پر تجربے کی رفتار خاصی تیز اور متنوع رہی ہے۔ یہ دور انتہائی پُرآشوب اور ہل چل سے لب ریز تھا اور پورا معاشرہ ایک انقلاب سے گزر رہا تھا۔ جس کی متحرک پرچھائیاں سندھی افسانے نے مؤثر انداز میں دکھائی ہیں۔

۲۔ زندگی کے تجربوں کی وسعت اور گہرائی نے تخلیق کاروں کے طرزِ احساس اور اظہار کو بھی پہلو دار بنا دیا ہے۔

۳۔ اس دور کا بنیادی اور غالب رجحان بھی سوشل رئیلزم یعنی سماجی حقیقت نگاری ہی رہا ہے لیکن اب حقیقت نگاری میں بھی کئی کئی جہتیں اور تہہ داریاں پیدا ہو گئی تھیں اور سپاٹ حقیقت نگاری کی گنجائش کم رہ گئی تھی بلکہ زندگی کے تمام خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی دنیائیں بھی حقیقت نگاری کے دائرہ کار میں آ رہی تھیں۔ چناں چہ معاشرتی و معاشی حقیت نگاری کے ساتھ نفسیاتی الجھنیں اور جنسی معاملات بھی افسانوں کے موضوع بنے ہیں۔

Scanned by CamScanner

۴۔ مواد اور موضوع کے تنوع نے اسلوب اور طرز نگارش میں بھی رنگا رنگی پیدا کی ہے اور ایک ہی افسانہ نگار نے مواد اور موضوع کی مطابقت کے لحاظ سے کئی طریقوں سے کہانیاں لکھی اور طرز نگارش میں ندرتیں پیدا کی ہیں۔

۵۔ جدیدیت کی عالمی تحریک نے سندھی زبان و ادب پر بھی اثر ڈالا ہے اور بعض لوگوں نے جدیدیت کے حامل موضوعات کو بھی اپنایا ہے۔ متعدد نوجوان ادیبوں نے محض فیشن کے طور پر ''اینٹی کہانی'' لکھنے کے تجربے کیے ہیں لیکن سینئر تنقید نگاروں مثلاً ابراہیم جویو، سوبھوگیان چندانی، رسول بخش پلیجو وغیرہ کی بروقت فہمائش نے اس بدعت کو پھیلنے سے روک دیا ہے جب کہ بعض پڑھے لکھے اور باشعور فن کاروں نے جدیدیت کو اپنے تجربے کا حصہ بنایا تو انھوں نے نئے اسلوب میں اچھی تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ ایسے لوگوں میں آغا سلیم اور منیر احمد مانک کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

۶۔ اس پورے دور میں تیز رفتار تخلیقی ہل چل اور سرگرمی جاری رہی ہے اور ہر دو تین سال کے بعد نئے لکھنے والوں کی تازہ کمک میدان میں اترتی رہی ہے جن میں سے بہت سوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا لوہا بھی منوایا ہے۔

۷۔ مقصدیت، قومی مقصدیت، قومی تحریک۔ اس عہد کے افسانوی ادب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس دور میں اچھی کہانیوں کے ساتھ حزاب اور پروپیگنڈا کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جن میں فنی اظہار کی بجائے نعرے بازی مقصود دکھائی دیتی ہے۔

افسانے میں جدیدیت کی تحریک

یوں تو قیامِ پاکستان کے بعد شروع ہی سے سندھی معاشرہ ایک قسم کی بے چینی، خلفشار اور نا آسودگی سے دوچار رہا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد ہی پے در پے بعض سیاسی اقدامات کی بنا پر سندھ کے رہنے والے محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے دستوری اور قانونی حقوق تک غیر محفوظ ہوتے جا رہے ہیں اور پاکستان کی مقتدر قوتیں شاید انھیں ان کے جائز سیاسی معاشی و معاشرتی حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔ سندھ سے کراچی کی علیحدگی جو آزادی کے دوسرے ہی سال وقوع پذیر ہوگئی تھی۔ اس بے اطمینانی کا جواز فراہم کرتی ہے۔ چناں چہ آزادی کے فوراً بعد ہی سے انھیں سندھ کے

Scanned by CamScanner

حقوق کے تحفظ کے بارے میں نہ صرف فکرمند ہونا پڑا بلکہ اس اقدام کے خلاف سیاسی جدوجہد کا آغاز بھی کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد دارالحکومت کی کراچی سے اسلام آباد منتقلی نے اس ناآسودگی کو مزید ہوا دی۔ ملک میں جمہوری روایت کے برعکس نوکر شاہی کی سازشیں اور جاگیردارانہ نظام کی دن بہ دن مضبوط ہوتی ہوئی گرفت نے پاکستان کی اقلیتی قومیتوں کو مسلسل فکرمند بنائے رکھا ہے اور بالآخر ملکی سطح پر جمہوریت کی ہلاکت اور فوجی حکومت کے قیام نے عوام دوست اور جمہوریت آشنا قوتوں کو مایوسی کی دلدل میں پھینک دیا تھا اور وہ مقتدرہ قوتوں کے خلاف عملی جدوجہد کرنے پر مجبور کردیئے گئے تھے۔ رہی سہی کمی ون یونٹ کے قیام نے پوری کردی تھی جس کے نتیجے میں سندھ سمیت تمام صوبوں کی جداگانہ حیثیت ختم کر کے انھیں نام نہاد وحدت مغربی پاکستان میں ضم کردیا گیا تھا اور اس طرح سندھ، بلوچستان اور سرحد عملاً پنجاب کی اکثریت کے زیرنگیں آچکے تھے۔اس صورتِ حال کو اقلیتی قومیتوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور ہر جگہ ون یونٹ کے خلاف زبردست جدوجہد جاری ہوگئی۔ سندھ کے عوام نے نہایت منظم اور منضبط طریقے سے ہمہ گیر مزاحمتی تحریک چلائی تھی۔ یہ مزاحمتی تحریک صرف ون یونٹ کے خاتمے کے خلاف نہ تھی بلکہ اسے سندھی قومیت کے تشخص کی تحریک کہنا زیادہ درست ہوگا۔ اس تحریک نے سندھ کے عوام کو تاریخ کے تناظر میں اپنے قومی تشخص کو تلاش کرنے کا شعور دیا اور زمینی حقائق کی روشنی میں تہذیبی خصائص کو جاننے کی خواہش بے دار کی اور ان میں حب الوطنی کے جذبات کو ابھارا۔ سندھیت کے جذباتی رویے کو ٹھوس حقیقی بنیادیں فراہم کیں۔ بے شک جیے سندھ تحریک کا سیاسی رخ کسی حد تک جذباتیت کا شکار بھی رہا ہے اور اس کے بعض گروہوں کی طرف سے محدود قوم پرستی، تنگ نظری اور ماضی پرستی جیسے غیر ترقی پسندانہ نعرے بھی بلند ہوئے ہیں لیکن اس تحریک کا ادبی اور ثقافتی رخ روشن خیالی کے نور سے دمکتا رہا ہے۔ دس پندرہ سالہ جدوجہد کے اس دور کو سندھ ہی نہیں بلکہ پورے پاکستان کی تاریخ سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ مسلسل جاری تاریخی دھارے ہی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ یہ عہد اپنے بعض مثبت تصورات کی وجہ سے جداگانہ خصائص بھی رکھتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے سندھی ادب نے عالمی تناظر میں مقامی ماحول کو دیکھنا اور سمجھنا شروع کردیا تھا۔ سماجی حقیقت نگاری اپنے تمام تر تقاضوں

Scanned by CamScanner

جلوہ سامانیوں کے ساتھ اس دور کے ادب پر اپنی مہر ثبت کر چکی تھی اور سندھی شاعر و ادیب موضوعی خیال پسندیت کے غبار سے نکل کر ارضی معروضیت سے اپنے رشتے استوار کر چکے تھے اور زندگی آمیز اور زندگی آموز مسائل اور موضوعات سے ادب کی سرخیاں فراہم کر رہے تھے۔ یہ دور وہ تھا جس میں حب الوطنیت اور مثبت قوم پرستانہ جذبات کی تیز و تند لہر رواں تھی جس میں کوئی دوسری آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی، ہر جذبہ ہر شعور، ہر خیال، ہر آواز، ہر سخن اور ہر بات سندھیت ہی کے محور کے گرد گھومتی تھی اور کسی ایسے خیال، تصور اور آواز کی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی تھی، جس کا تعلق زمینی حقائق، مسائل اور موضوع سے نہ رہا ہو۔ اس اجتماعی طرزِ احساس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہر شخص ایک ہی لب و لہجہ اور ایک ہی انداز میں بات کر رہا تھا۔ نہیں یہ خیال درست نہیں ہے۔ بلکہ سندھی قومیتی تحریک کے زیرِ اثر پیدا ہونے والا ادب جہاں روشن خیالی، ترقی پسندیت اور جمہوریت نواز تھا وہیں اس میں اَن گنت تجربات اور اسلوب و اظہار کے بے شمار جدا جدا نمونے بھی تخلیق ہو رہے تھے۔ جن کی وجہ سے سندھی ادب نہایت رنگا رنگ، متنوع، جاذب توجہ اور موثر ہو گیا تھا اور ایسا صرف اس لیے ہوا تھا کہ اس دور کا ادب بالعموم نعرہ بازیوں کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ہمہ جہت تجربوں کے سوتوں سے پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اس تحریک کے دوران بہت سا جذباتی ملغوبہ اور غیر تخلیقی رطب و یابس بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن وقت کی کسوٹی نے ایسے عام، غیر تخلیقی عناصر کو فراموش گاری کے کوڑے دان میں پھینک دیا ہے اور اس دور کا صرف وہی ادب باقی رہا ہے جس کی تخلیقی بنیاد سچے جذبے اور مضبوط جمالیاتی قدر پر استوار تھی۔

ون یونٹ کا خاتمہ صوبہ سندھ کی بحالی اور جمہوریت کے احیا نے عملاً سندھی قومیت کی تحریک کو ختم کر کے رکھ دیا اور کم و بیش دو عشروں پر محیط جدوجہد دیکھتے دیکھتے اس طرح بکھر کر رہ گئی جیسے اب اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہ گیا ہو اور وہ فکری ہم آہنگی جو اس مزاحمتی تحریک کی بنیاد تھی، منتشر مزاجی اور بے سمتی کا شکار ہو کر رہ گئی۔ سندھی ادیب، شاعر اور دانش ور اپنی عملی جدوجہد کو نسبتاً کامیاب بنا چکے تھے اور احساسِ کامرانی نے انھیں اضمحلال اور تھکن کا غلاف اوڑھا دیا تھا اور ان میں تخلیقی عمل کا جوش سرد ہو چلا تھا لیکن کامرانی کا یہ خواب بہت جلد ٹوٹ گیا اور سندھ کے تخلیق کاروں کو جدوجہد کے

Scanned by CamScanner

ایک دوسرے مرحلے میں قدم رکھنا پڑا۔ یہ جدوجہد سندھی تشخص کے حصول کی جدوجہد نہیں تھی بلکہ معاشی و معاشرتی ناہمواریوں سے نجات پانے کی جدوجہد تھی۔ اس پس منظر میں جو ادب اُنیس سو ستر (۱۹۷۰ء) کے بعد تخلیق ہوا ہے اس میں مختلف فکری دھارے اور نت نئے اسلوبیاتی چشمے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے باہمی اختلاط سے ایک فکری و اسلوبیاتی دھنک ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں اس بات کو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ نئے خیالات و تصورات نے سندھی ادب کے مخصوص کردار یعنی انسان دوستی، روشن خیالی، ترقی پسندیت اور جمہوری اقدار کی پاس داری کو مزید جلا بخشی ہے۔ اور وہ نئے نئے خیالات کے پس منظر میں زیادہ روشن اور جاذبِ توجہ ہوتا چلا گیا ہے اور اس کی معنوی تہہ داری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

سن ستر (۱۹۷۰ء) کی دہائی کے آس پاس سندھی ادب جن نئے تصورات و خیالات سے دوچار ہوا ہے۔ ان میں سرفہرست جدیدیت (Modernism) کی تحریک سے متاثر خیالات تھے۔ جدیدیت (Modernism) کی تحریک دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد یورپ کے مخصوص معروضی حالات اور احساسات کے تحت پیدا ہوئی تھی اور اس میں معاشرہ کے مقابلے میں ''فرد'' کے مسائل اور احساسات کو تخلیقی سرگرمیوں کا محور سمجھا گیا تھا۔ ویسے تو اس تحریک کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی سے شروع ہو چکی تھی اور فلسفیانہ بنیادوں پر ایسے ادبی رویّوں کی پذیرائی ہونے لگی تھی، جن میں انسانی معاشرہ کی یک جہتی کے مقابلے میں ''فرد'' کی وجودیت پر اصرار کیا جارہا تھا۔ خاص طور پر ژاں پال سارتر، سیمون ڈی بوار، البرٹ کامیو، فرانزز کافکا، دوستوفسکی، ورجینیا وولف، رلکے، البرٹ مورادیا وغیرہ جیسے صفِ اوّل کے لکھنے والے کسی نہ کسی انداز میں جدیدیت کی تحریک کے حامی رہے ہیں لیکن بغور دیکھیے تو یورپ کی ماڈرن ازم کا ایک معروضی جواز بھی موجود تھا نیز مغربی دانشور فلسفیانہ سطح پر زندگی کی معنویت اور انسانی معاشرہ کی اجتماعی بہبود اور فلاح سے قطعی بے بہرہ نہیں ہوگئے تھے۔ چناں چہ ژاں پال سارتر کا بار بار اپنے مارکسسٹ ہونے پر اصرار کرنا اور عالمی امن کی تحریکوں میں تواتر سے شرکت ان کے رویوں کو مثبت رُخ دیتا ہے۔ یورپ کی ماڈرن ازم کا زیادہ تر تعلق ادب میں اسلوبیاتی اظہار اور ادب کی خود مختیاری سے تھا اور وہ ادب کو ہر قسم کی جبریت سے آزادی دلانے

Scanned by CamScanner

پر اصرار کرتی تھی۔ یعنی وہ ادب کی مکمل خودمختیاری کے پرچارک تھے۔

سندھ کے معروضی حالات یقیناً ماڈرن ازم کے تصورات کے فروغ کا جواز فراہم نہیں کرتے تھے لیکن ایک طویل جدوجہد کے بعد مزاحمتی تحریک کے بکھر جانے اور ادب میں مقصدیت کے شدید اثرات اور سندھی نوجوانوں کے خوابوں کی شکستگی کے ردعمل نے جدیدیت کی تحریک کے لیے بظاہر جواز پیدا کردیا تھا۔ یوں بھی جدیدیت کے وکلا جدیدیت کی توجیہہ کرتے ہوئے اسے بالعموم رواں روایت، رسمیات اور رواج کے جابرانہ اثرات کے خلاف ردعمل کا اظہار ہی بتاتے ہیں تاکہ کائنات کے مظاہر میں فرد کی عملی حیثیت کو ممکنہ طور پر اجاگر کیا جاسکے۔ اس نکتۂ نظر سے جدیدیت کو بعض حلقوں نے ادب میں مقصدیت کے مقابلے میں نتائج خیزی (Pragmatism) بھی قرار دیا ہے۔

یہاں ہم جدیدیت کی فلسفیانہ بحث اور اس کی موشگافیوں میں الجھنے کی قطعی خواہش نہیں رکھتے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیں گے کہ سندھی ادب میں جس جدیدیت کا اظہار ہوا ہے اس کے خدوخال کیا رہے ہیں۔ اور اس نے سندھی ادب کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ ہر معاشرتی انسان اپنی ذات میں ایک کائنات لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یعنی: ہر آدمی بجائے خود ہے محشر خیال، یہ داخلی کائنات انسان کے خوابوں، جذبوں، اندیشوں، خواہشوں اور واہموں سے وجود پاتی ہے، اور اس کے خیالات، تصورات، احساسات، منکرات سے عبارت ہوتی ہے۔ زندگی کا احساس، موت کے خوف سے آزاد نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح خوشی، مسرت اور آسودگی کی خواہشیں خوف دہشت، اور ناآسودگی کی سرحد سے لگی ہوتی ہیں۔ انسان کی داخلی دنیائیں دراصل خارجی دنیاؤں کے عکس ہیں۔ باہر کی محرومی اندرونی ناآسودگی کو جنم دیتی ہے اور معاشرہ کی جبریت فرد میں تنہائی، بوریت اور کراہت کے احساسات پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ادب کا مطالبہ اور خواہش کہ وہ انسان کی بیرونی دنیاؤں کے ساتھ ساتھ اس کے اندرونی خلفشار اور دروں خانۂ احساس کی عکاسی بھی کرے بھلا کیوں کر ناواجب ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا جدیدیت کے مثبت تصورات سندھی ادب میں پہلے بھی موجود رہے ہیں اور کوئی عہد انسان کی انفرادیت سے منکر نہیں ہوا کرتا۔

Scanned by CamScanner

جدیدیت کی عالمی تحریک کے تحت نئے خیالات کو جس فن کار نے سندھی ادب میں زیادہ تن دہی اور اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے وہ منیر احمد مانک ہے۔ منیر احمد مانک نے جدیدیت کے اہم تصور 'وجودیت' کو سندھ میں جاری مزاحمتی تحریک سے وابستہ کر کے پیش کیا ہے، گویا اس نے سندھیت کی خودشناسی کی تحریک کو سندھی خود وجودیت کی تحریک کا درجہ دے دیا ہے۔ مانک خود اس دور کی پیدائش ہے جس میں سندھی ادب ایک زبردست ہل چل اور رست و خیز سے دوچار تھا۔

مانک سندھی کی کہانیوں کے مجموعہ ''حویلی کا راز'' میں شامل کہانیاں تخیلاتی کرتب بازی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کہانیوں کی بنیادیں زمینی حقائق میں پیوست ہیں۔ وہ سندھ کے جاگیردارانہ سماج کی فرسودہ رسم و رواج اور جبریت کے خلاف مؤثر اور کاری ضرب لگاتا ہے جس کا ارتعاش مستقل طور پر ادب میں جذب ہو کر رہ جاتا ہے۔

مانک کی بالعموم دوسری کہانیوں میں بھی وجودی مسئلہ کسی نہ کسی رخ سے ظاہر ہوتا ہے اور زندگی کی اثباتی قدروں کو ان طاقتوں کے مقابل لاتا ہے جو زندگی کی فعالیت اور فطری اظہار کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ چناں چہ وہ حقیقت نگاری کے دائرے سے باہر نہیں جاتا کہ حقیقت کے ایک رُخ کے انکار سے وہ حقیقت کے دوسرے رخ کو نمایاں کر جاتا ہے اور اس طرح سیاہ کو سفید سے جدا کر دکھاتا ہے۔ چناں چہ اپنی کہانی ''باہر بھاپ نہ نکری'' میں وہ ایک ایسی جوان بیوہ کی روداد لکھتا ہے جو اپنے ابلتے ہوئے فطری جذبات اور تقاضوں کو دبانے کے لیے ان پر نماز روزے کے ڈھکن رکھا کرتی ہے تاکہ اس کے جذبات کی بھاپ باہر نکل نہ پائے۔ لیکن اس کے باطن میں جو قیامت خیز خلفشار اور ہیجان برپا ہوتا ہے، اس کا اظہار مانک نے اتنے حقیقت پسندیت، اشارتی اور مؤثر انداز میں کیا ہے کہ مذکورہ کہانی نہ صرف اس عہد کی بلکہ سندھی ادب کی چند منتخب کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

مانک کے علاوہ اس عہد کے نمائندہ اور رجحان ساز افسانہ نگاروں میں ممتاز مرزا، مشتاق احمد شورو، نور گھلو، ممتاز مہر، قاضی خادم، خیر النسا جعفری، رسول میمن، نور الہدیٰ شاہ، بادل جمالی، افسر اعجاز، رزاق مہر، مدد علی سندھی، کھر شوکت، شر جیل، افسر جانوری، بدر ڈامرو، شوکت حسین شورو، بیدل مسرور، عابد مظہر اور پیر محمد کیلاش، ڈاکٹر

Scanned by CamScanner

ڈر محمد پٹھان، وہاب سھتو، الہ داد بوھیو، عابد لغاری، ملک اگانی، ممتاز عباسی، رکن شاہ رضوی، بادام ناتواں وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کا تعلق پیش رو نسل سے بھی رہا ہے اور وہ ستر کی دہائی سے پہلے ہی اپنی شناخت قائم کر چکے تھے لیکن جدید رجحان کے ساتھ بھی دوچار قدم ہم رکاب رہے ہیں اور انھوں نے نئے اظہاری وسیلوں اور تکنیکی ندرتوں سے سندھی افسانے کو ثروت مند بنایا ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ جدیدیت کے اکثر موضوعات سندھی ادب کے لیے نئے نہیں ہیں اور جہاں جہاں انسانی جبلت، دروں خانہ احساس اور اندرونی دنیا سے شاعروں اور افسانہ نگاروں کا واسطہ پڑا ہے، انھوں نے ان موضوعات کو بھی تصویر کر دکھایا ہے۔ انسانی خیالات و احساسات کی ہزار صورتیں اور ہزار جلوے ہوا کرتے ہیں اور ان میں تبدیلیاں بھی اتنی ہی سرعت سے برپا ہوتی ہیں کہ ان کے بدلتے ہوئے موڈ کے درمیان حد فاصل کھینچنا اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ فرد تنہائی میں کیوں کر انجمن آرائی کرتا ہے، موت کا خیال کیسے کیسے تخیلات کو جنم دیتا ہے۔ خوشی، امید اور مسرت کے نام پر آدمی کیا کھل کھیلتا ہے۔ مایوسی (depression)، بیگانگیت (alienation)، بوریت (Boredom)، کراہت (Nausea)، خود فریبی اور احساس جرم وغیرہ ادب کے بنیادی موضوعات رہے ہیں اور ڈاکٹر غفور میمن نے اپنی کتاب ''سندھی ادب جو فکری پس منظر'' میں قدیم و جدید سندھی ادب سے مثالیں دے دے کر دکھایا ہے کہ ان موضوعات کو شاہ عبداللطیف بھٹائی سے لے کر جدید عہد کے لکھنے والوں نے کس کس طرح برتا ہے لیکن ان موضوعات کا کبھی کبھار بہ طور موضوع برتاؤ اور ان کا ایک مستقل رجحان اور طرزِ فکر کے طور پر اظہار میں فرق ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ اس اعتبار سے جدیدیت کے مذکورہ بالا مضامین ایک رجحان اور فکری رویے کے طور پر اسی عہد میں ظاہر ہوئے ہیں۔

مانک کے افسانوں میں وجودی مسئلہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، اس نے اپنی کہانیوں کا مواد آس پاس کی زندگی ہی سے حاصل کیا ہے اور یہی بات مانک کو بے ربط (Irrelevant)، نان کمیٹل (Non Commitel) اور غیر حقیقت پسندانہ (unrealistice) ہونے سے بچا لیتی ہے۔

ممتاز مہر کے دو مجموعے ''ھک زندگی جو وھکرو'' (زندگی کی روانی) اور ''منزل''

Scanned by CamScanner

شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں شامل اکثر افسانوں میں سادہ بیانیہ کے استعمال سے بھی خاصی پر تاثر کہانیاں وجود میں آئی ہیں۔ بعض کہانیاں علامتی طرزِ اظہار لیے ہوئے ہیں اور کہیں انجام کو پے چیدہ بنا دیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والا لمحہ بھر رک کر کہانی کے کرداروں کو محسوس کرے اور واقعے کے تانے بانے سے اپنے نتائج خود اخذ کرے۔ ان کہانیوں کا ماحول اور طرز اظہار عام سیدھی سادھی بیانیہ کہانیوں سے مختلف ہے اور ان سے بجا طور پر حظ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان میں بیان کردہ علامتوں اور اشاروں کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔ ممتاز مہر بھی اپنی کہانیوں کا مواد آس پاس کے ماحول ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اس کی کہانیوں میں سے بعض میں مایوسی، فراریت اور بے کسی سے دوچار ہوتے ہوئے انسانوں کی واردات بیان ہوتی ہے مثلاً 'یادن کھاں انتقام' (یادوں سے انتقام) میں ٹیکسی ڈرائیور ایک ایسی لڑکی کو جو اس کے اختیار اور قبضے میں رہی تھی، معاشرے میں اس لڑکی کی بدنامی کے خیال سے اس کے عزیزوں میں واپس چھوڑ آتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی یہ نیکی اور زندگی بھر اسے ڈستی رہتی ہے اور وہ زندگی کے عام چلن میں بار بار فراریت اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ''اندھا کنواں'' میں دکھایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ آدمی زندگی کی مسلسل شکستوں کے نتیجے میں بے کسی و بے بسی کے احساس سے کس طرح دوچار ہوتا ہے۔

مشتاق احمد شورو کی کہانی ''من جي مونجھ ء بوسات'' (دل کی گھٹن) میں ایک نچلے طبقے کے نوعمر لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو معمولی معمولی کام کر کے گزر بسر کرتا ہے، جس کی زندگی میں کوئی امید کوئی آس، کوئی خواہش اور کوئی لگن باقی نہیں رہی ہے۔ ماحول اور زمانہ اس سے جس طرح چاہتا سلوک کرتا ہے یا وہ اپنے اوپر گزرتی ہوئی افتاد کو بہ ظاہر جھیلتا رہتا ہے لیکن ہر واردات کے نتیجے میں جو احساسات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کی زندگی میں کراہت کا احساس پیدا کر دیتے ہیں اور کراہت کا یہ احساس اس حد تک بڑھتا ہے کہ اس کے لیے خود اس کا اپنا کردار اپنا جسم اپنا آپ کراہت زدہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ سے بھی کراہت محسوس کرنے لگتا ہے۔

خیر النسا جعفری کی کہانی ''حویلی کھاں ہاسٹل تیں'' (حویلی سے ہاسٹل تک) نہایت دلچسپ اور حقیقت آشنا کہانی ہے کہ اس میں جاگیردارانہ معاشرے میں رہتی ہوئی

Scanned by CamScanner

عورت کی زندگی کے مختلف روپ سروپ دکھائے گئے ہیں، قدم قدم پر پابندیوں کے پھندے اور ان سے نبرد آزما ہوتی ہوئی انسانی فطرت، نتیجے میں بغاوت کے جذبات کا ابھرنا یہ بغاوت کبھی چالاکی سے کام لے کر کونے کھدرے تلاش کرتی ہے اور کبھی آمنے سامنے دو بدو مقابلے میں سماجی ریتوں اور رواجوں کو شکست دے دیتی ہے۔ خیر النسا جعفری انتہائی نازک موضوع پر بھی بہت ذمہ داری سے قلم اٹھاتی ہیں اور انسانی نفسیات کے ساتھ معاشرہ کی اجتماعی نفسیات کی باریکیوں کو بھی ملحوظ رکھا کرتی ہیں۔ عورتوں کے سماجی اور انسانی مسائل ان کے خاص موضوعات ہیں اور ان موضوعات پر وہ وقتی جذباتیت سے بلند تر ہو کر قلم اٹھاتی ہیں۔

اسی طرح نور الہدیٰ شاہ نے بھی سندھی معاشرے کے بوسیدہ رسم و رواج کی شکار اور جاگیردار سماج کی مکروہات میں گھری ہوئی عورت ذات کی کہانی لکھی ہے، لیکن ہم خیرالنسا جعفری اور نور الہدیٰ شاہ کا ذکر محض خاتون افسانہ نگار کے طور پر نہیں کرنا چاہیں گے کہ ان کی تخلیقی سرگرمیاں کسی بھی اہم فن کار کے دائرہ کار سے جداگانہ نہیں ہیں۔ نور الہدیٰ شاہ کو اپنے ہم عصروں پر ایک فوقیت یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ماحول سازی اور فضا بندی میں درجۂ کمال پر فائز ہیں۔ اسی طرح کردار نگاری بھی ان کا شعبۂ خاص ہے۔ ان کے مجموعے 'کربلا'، 'جلاوطن'، 'رن اور رج جو اتھاس' (عورت اور آسودگی) میں شامل کہانیاں ان کی پختہ کاری کی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

اس عہد کا سب سے روشن پہلو تکنیکی تجربات کی رنگا رنگی ہے، لکھنے والوں نے نئے موضوعات پر اظہار خیال بھی نئے نئے انداز سے کیے ہیں اور طرز نگارش کی نت نئی جھلکیاں دکھائی ہیں لیکن جہاں موضوع اور مواد اپنے ماحول اور زمینی حقائق سے باہر نکل گیا ہے، یعنی غیر فطری انداز اختیار کر گیا ہے۔ وہاں کہانی کا صرف ڈھانچہ باقی رہ جاتا ہے۔ تاثر اور ماجرائیت سے عاری۔ ایسی کہانیاں یقیناً کامیاب تجربے کی ذیل میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ اظہار و بیاں کے تجربے اور نئے نئے تکنیکی وسیلے ہر دور میں برتے گئے ہیں لیکن اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا گیا ہے کہ ہر تکنیکی تجربہ کہانی کی ماجرائیت، مواد اور موضوع سے باہم پیوست رہے اور محض بالائی سطح پر لفظوں کی کاری گری بن کر نہ رہ جائے، کیوں کہ کہانی کی اصل روح تو اس میں بیان کردہ موضوع اور مواد سے ہوا

Scanned by CamScanner

ہوتی ہے۔

چناں چہ تکنیک کو ذریعۂ اظہار ہی رہنا چاہیے اور بجائے خود مقصد نہیں بننا چاہیے۔ جہاں لوگوں نے تکنیک کو مقصود بالذات قرار دیا ہے، وہیں وہ اپنی تخلیقی پیش کش میں ناکام رہے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں خواتین افسانہ نگاروں کی بھی کثیر تعداد شامل ہے جنھوں نے معاشرتی مسائل خاص طور پر سندھی معاشرے میں خواتین کے مسائل اور عورتوں کی معاش، معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان خواتین افسانہ نگاروں نے سماجی رسومات اور بعض مذہبی تصورات کے ہاتھوں عورتوں اور بچوں کے استحصال کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں شامل چند نام درجِ ذیل ہیں:

بیگم زینت عبداللہ چنہ، رشیدہ حجاب، مہتاب محبوب، ثمیرہ زریں، زرینہ بلوچ، شمس نور الدین سرکی، روشن آرا مغل، ثریا یاسمین، جمیلہ تبسم، جمیلہ نرگس، مس جمانی، ذکیہ دریشانی، مس آفتاب اقبال شیخ، پروین سومرو، ارشاد قمر، بلقیس سیّد، ممتاز عارابی، نصرت بھٹو، آفتاب بانو عباسی، صحرا مارئی عالم، فریدہ مغل، ایس تبسم، مہتاب منور عباسی، زیب النسا مسرت، سکینہ میمن، نیلوفر جویو، نسیم تھیوبو، فہمیدہ میمن، ثریا سوز ڈیپلائی، رعنا شفیق، نسرین جونیجو، سلمٰی صدیق، ج ع منگھانی، تبسم عروج قاضی، جہاں آرا سومرو، سعدیہ میمن، زبیدہ متھلو، سبحان گاد، صفورہ خانم راہوجا، خالدہ سومرو، جبین کاکی پوتہ، تہمینہ ناز جونیجو، الماس سندھو، حمیدہ مہتلو، عذرا چنہ وغیرہم۔

اس دور میں لکھنے والوں میں کم کم افسانہ نگار ہیں جو اپنے مجموعے شائع کرا سکے ہیں لیکن اس کے باوجود اس عہد میں چھپنے والے مجموعوں کی تعداد خاصی معقول کہی جاسکتی ہے۔

نئے تکنیکی اظہار کے ساتھ بعض نئے موضوعات پر بھی متواتر لکھا گیا ہے۔ جیسے انسان کے نفسیاتی و جنسی مسائل پر پہلے اگر ڈھکے چھپے اظہار خیال ہوتا تھا تو اس دور میں ان موضوعات پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ ایک اور موضوع انسان کی دبی ہوئی خواہشات کا اس کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کے اظہار میں ہوا ہے۔ یعنی انسان معاشرتی رسم و رواج اور اخلاقیات کے پیشِ نظر اپنی بعض فطری خواہشات کو دبا دیتا ہے تو ایسی

Scanned by CamScanner

خواہشات اصلاً ختم نہیں ہوتیں بلکہ کسی دوسرے رویے میں ظاہر ہو کر رہتی ہیں جس کے اثرات پہلے سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ اس موضوع پر کئی اہم افسانے لکھے جا چکے ہیں۔

ناول نگاری کا منظر نامہ

ہم گزشتہ صفحات☆ میں دیکھ چکے ہیں کہ سندھی ادب میں فکشن کی ابتدا ناول سے ہوئی تھی اور وہ ڈاکٹر جانسن کی ناول راسیلاس تھی جو ۱۸۷۰ء میں اسی نام سے سندھی میں منتقل کی گئی تھی، سب سے پہلی طبع زاد ناول مرزا قلیچ بیگ کی 'دل آرام' تھی، اس کے بعد ان کی شہرۂ آفاق ناول 'زینت' منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس پورے دور پر مرزا قلیچ بیگ کی ادبی شخصیت سندھی ادب پر سایہ فگن رہی ہے۔ دوسرے دور میں یعنی بیسویں صدی کے نصف اول میں قسط وار ناول لکھنے کا رواج تھا جو اخبارات و رسائل کی زینت بنا کرتے تھے یعنی ان کا مقصد قصے کو طول دے کر رسائل و جرائد کو مقبول عام بنانا تھا۔ چناں چہ اسی دور میں ''چندر کانتا باسنتی''... نامی ناول کی پینتالیس قسطیں شائع ہوئی ہیں۔

تقسیم کے آس پاس ترجموں کی بہار تھی اور مختلف اشاعتی اداروں اور ادبی و سماجی انجمنوں کی طرف سے انگریزی، بنگالی، مرہٹی اور اردو کی مقبول ناولوں کو سندھی ماحول میں adopt کرنے کا چلن حسبِ معمول جاری تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ایم آر مائیداساٹی نے ٹیگور کے ناول 'بغاوت' کا ترجمہ شائع کیا۔ اس سے قبل گلی کرپلانی ٹیگور کے ناول 'گورا' کو سندھی قالب دے چکی تھیں اور پروفیسر رام پنجوانی ایک دلچسپ انگریزی ناول کو 'پدما' کے نام سے ترجمہ کر چکے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں نارائن داس ملکانی نے روسی ناول کا ترجمہ 'بھوک' کے نام سے پیش کیا تھا۔ اسی زمانے میں گوبند مالھی نے متعدد ناولوں کو جن میں جنگ آزادی کی کہانی بیان کی گئی تھی سندھی میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔

اردو سے متعدد تاریخی ناولوں کے ترجمے ہوئے جن میں سے 'حور دمشق'، 'خنجر ہلال'، 'منصور موہنا' وغیرہ خاں بہادر محمد صدیق میمن نے کیے، خاں بہادر محمد صدیق میمن نے علامہ راشد الخیری کی 'صبحِ زندگی' اور 'شامِ زندگی' کو 'زندگی جو پھریوں دور' اور 'زندگی

☆ کتاب کے جداگانہ باب میں ناول نگاری کے جائزے لے گئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

جو بیو دور' کے نام سے پیش کیے اور فتح محمد قریشی کی 'دُرِیتیم' وغیرہ بھی اسی زمانے میں پیش ہوئی اسی عہد میں محمد عثمان ڈیپلائی نے تاریخی ناولوں کا ایک سلسلہ قائم کر رکھا تھا ان کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ وہ سال میں دو تین ناول شائع کر دیتے تھے۔ ان کی بیش تر ناول قسط وار چھپتی تھیں۔ محمد عثمان ڈیپلائی نے سو سے زائد ناولیں لکھی ہیں جن میں طبع زاد ناول بھی تھیں اور ترجمہ و تلخیص بھی۔

طبع زاد ناولوں میں آسانند مامتورائے کا ناول ''شاعر'' خاصا مقبول ہوا۔ جو سندھی زبان میں پہلا نفسیاتی ناول تھا۔ ۱۹۴۲ء میں سندر ساہت منڈل کی طرف سے پیتامبر کشنانی کا ناول 'پریم بندھن'۔ ۱۹۴۳ء میں پروفیسر پنجوانی کا 'قیدی'، 'شرمیلا' اور ۱۹۴۴ء میں 'لطیفا'۔ ۱۹۴۶ء میں 'اساں جو گھر' (ہمارا گھر) اور 'چاندی کی چمک' وغیرہ شائع ہوئی ہیں۔

نارائن داس بھمبھانی کی مشہور عالم ناولیں 'مالن' (۱۹۴۲ء)، 'ودھوا' (۱۹۴۳ء) اور 'غریبن جو ورثو' (۱۹۴۶ء) میں شائع ہوئی تھیں ان ناولوں میں دیہی سندھ کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ یہی وہ ناول ہیں جن سے سماجی حقیقت نگاری کو سندھی ناول کے باب میں استحکام حاصل ہوا ہے۔ ۱۹۴۶ء ہی میں نانک رام دھرم داس کی سماجی ناول آرام محل اور ۱۹۴۷ء میں ج۔ د۔ آھوجا کی ناول 'رانی' شائع ہوئی تھیں۔

تقسیم کے بعد سندھی ادب جس صورتِ حال سے دوچار ہوا اس کا اظہار کیا جا چکا ہے، ناول نگاری پر نسبتاً زیادہ کٹھن وقت پڑا تھا کہ ہندو ناول نگار ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے تھے۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ لے دے کے محمد عثمان ڈیپلائی کا دم غنیمت تھا کہ کچھ وقفے کے بعد انھوں نے ناول نگاری کے کام کو دوبارہ شروع کر دیا تھا۔

پرانے اداروں کی جگہ نئے ادارے وجود میں آنے لگے تھے مثلاً فردوس پبلی کیشن ہالا، سندھی ادب ٹنڈو محمد خان، ادبی ادارہ حیدرآباد، پرہ پٹی حیدرآباد اور آواز ادب حیدرآباد، جیسے اداروں نے سندھی ناولوں کی اشاعت کی بطور خاص حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس دور میں جو اہم ناول شائع ہوئے ہیں ان میں انجم ہالائی کی ناول 'کاروانِ زندگی' حسینی محمد حافظ کی ناول 'تباہی'، سیّد حیدر شاہ کی 'زمیں دار'، رسول بخش خمار کی 'حنا'، حافظ

Scanned by CamScanner

حیات شاہ کی 'سلطانہ'، قاضی عبدالکریم کی 'نوراں'، فضل احمد بچائی کی 'نازیو' لطف اللہ بدوی کی 'ابیلا'، خواجہ غلام علی الانہ کی 'لاش'، ڈاکٹر منظور احمد عرسانی کی 'کلب گھر'، ناصر نورائی کی 'راتیوں جاگن جی' (راتیں جاگنے کی)، اللہ بخش تالپر کی 'پردیسی جو پیار'، راز بلڑائی کی 'گلبدن'، 'بھوک' اور 'بے روزگاری' اور 'شرابی' وغیرہ انور ہالائی کی ناول 'آوارہ'، ساز نوء آبادی کا 'شکستہ ساز'، گل نصیر پوری کا 'دریا کی کپت تی'، ڈاکٹر عبدالجبار جونیجو کی 'سوری آسینگار' اور شیخ محمد حسن کی ناول 'بولی' وغیرہ۔

یہ تمام ناول وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے چند ناول سماجی حقیقت نگاری کے تحت معاشرے کی سچائیوں کی آئینہ دار تھیں لیکن بعض محض روایتی انداز کی تھیں جو وقت گزاری کے لیے لکھی جاتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ناول نگاری کے جمود کو سب سے پہلے محمد عثمان ڈیپلائی نے توڑا تھا، انھوں نے پے در پے تاریخی و نیم تاریخی نوعیت کی ناولیں لکھیں۔ ان میں 'انور پاشا'، 'آزادی کی جنگ'، 'دکن جا مجاہد'، نازنینِ سمرنا'، 'گم راہ مسافر'، 'فتحِ اسپین'، 'فتحِ یرموک'، 'قسطنطنیہ کی شہزادی'، 'سومنات جی سُندری'، 'شیر ایران'، 'جاپانی گڈی'، 'کارا کافر'، 'مسلمان عورت'، 'شیش محل'، کوریائی کنوار'، مصطفیٰ کمال'، 'ڈاہر جو رنگ محل'، 'نورِ توحید'، 'گلستانِ حسن' وغیرہ شامل ہیں لیکن جو شہرت ان کے ناول 'سانگھڑ' کو ہوئی وہ شہرت کسی دوسری ناول کو نہ ملی تھی۔ 'سانگھڑ' اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی ایک اہم ناول ہے کہ اس کا موضوع سندھ میں 'حُر تحریک' پر انگریزوں کے مظالم کی داستان ہے۔ کسی بڑے سیاسی و معاشرتی اور حساس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی تخلیق ہے۔ 'سانگھڑ' میں دکھائے گئے ماحول اور اس سے پیدا ہونے والے تاثر نے اس ناول کو سندھ میں جاری قومی تحریک کا بھی حصہ بنا دیا ہے۔ سماجی حقیقت نگاری کے اعتبار سے بھی اس کی اپنی اہمیت ہے کہ کسی عوامی تحریک پر براہ راست لکھی جانے والی یہ پہلی ناول ہے۔

اس عہد کے فوراً بعد نہایت اہم ناول سراج الحق میمن کی 'پڑادو سوئی سڈ' (بازگشت) منظرِ عام پے آئی ہے۔ مذکورہ ناول ترخان اور مغل دور کی تاریخ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یوں تو یہ ایک سیدھی سادھی محبت کی کہانی ہے لیکن بہ غور دیکھیے تو تہہ در تہہ معنویت سے ہم کنار ہے۔ چوں کہ کہانی ترخان اور مغلیہ عہد سے تعلق رکھتی ہے لہٰذا

Scanned by CamScanner

اس کا تمام ماحول اور لوکیل تاریخ کے اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں سراج الحق میمن نے اس عہد کی جزئیات کو اس طرح اپنے تصور میں ترتیب دیا ہے کہ مغلیہ عہد میں سندھ کی صورت حال زندہ اور متحرک ہو جاتی ہے۔ تاریخی ناولوں کے باب میں ایک غلط فہمی بالعموم یہ پائی جاتی ہے کہ کسی گزرے ہوئے عہد کے بارے میں محض بیانیہ انداز میں منظر کشی کر دینے سے تاریخی ناول لکھنے کا منصب پورا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ادب میں تاریخی ناول بالعموم اسی سطحی نکتہ نظر سے لکھی جاتی ہیں لیکن اصل معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ ادب تاریخی ناول لکھنے والے سے اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ اس عہد کے بارے میں ایک مبصر کی طرح تبصرہ یا کمنٹری نہ کرے بلکہ اس عہد کو اپنے تمام رنگوں کے ساتھ دوبارہ تخلیق کر کے دکھائے۔ اس معیار پر بہت کم تاریخی ناول پوری اترتی ہیں۔ سراج الحق میمن کی ناول ''پڑادو سوئی سڈ'' اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ چناں چہ تاریخی ناول نگاری کے باب میں بھی اسے سنگ میل کی حیثیت حاصل رہے گی۔

اس ناول کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں جو واقعات و حالات بیان کیے گئے ہیں جو منظر کشی کی گئی ہے، کرداروں نے جو خواب دیکھے ہیں اور جس طرح ان خوابوں کی شکست و ریخت ہوئی ہے، ان سب کا اطلاق آج کے عہد میں پائے جانے والی حقیقتوں پر بھی ہو رہا ہے۔ یعنی سراج الحق میمن ماضی کے آئینے میں لمحہ موجود کی بھی صورت گری بھی کر رہے ہیں اور اس کے باوجود فنی دائرہ سے باہر قدم نہیں نکالتے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ یہ تاریخی ناول ہونے کے باوجود آج کی معروضی صورتِ حال اور اس سے پیدا ہونے والے احساسات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ مغلوں نے سندھ پر ترخانوں کے ذریعے جو مظالم ڈھائے ہیں اور سندھ کو بیرونی حملہ آوروں اور قسمت آزماؤں نے جس طرح لوٹا کھسوٹا ہے، سراج ان سب کا نقشہ اس عمدگی سے کھینچتا ہے کہ ہر صفحہ پہ آج کی سرگزشت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ چناں چہ اس ناول کی ایک اہمیت اس کا علامتی طرز اظہار بھی ہے۔ بظاہر سراج صدیوں پرانی حکایت لکھ رہا ہے لیکن حقیقتاً اس کا مقصد و مدعا آج کی معروضی صورتِ حال کی عکاسی بھی رہی ہے، علامت اور استعارے کا اس انداز میں استعمال جداگانہ ندرت رکھتا ہے۔

سراج الحق میمن کی ناول ''پڑادو سوئی سڈ'' سندھ کے مزاحمتی ادب میں نہایت

اعلیٰ مقام کی حامل ہے کہ اس میں سندھ میں ابلتی ہوئی سندھیت اور حب الوطنیت کی لہریں موجزن ہیں۔ ماضی کو حال کے آئینہ میں دیکھنا اور کل کی سرگزشت میں آج کی صورتِ حال کا عکس دکھانا یقیناً غیر معمولی بات ہے۔ جوفنی بالیدگی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمایئے۔

''سندھ... سندھ... سندھ...'' سوڈھل نے تقریباً روتی ہوئی آواز میں کہا... ''کہاں ہے سندھ؟ کیا یہ سندھ ہے؟ زخم زخم سسکتا ہوا، جس پر مردہ خور گدھوں کے غول کے غول جھپٹ پڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ہی دو دو کا سندھ تھا؟ کیا یہی تماچی کا سندھ تھا؟ کیا یہی دولھ دریا خاں کا سندھ تھا؟ وہ دیکھو لو سندھ کی لاش سڑ رہی ہے، وہ دیکھ لو ٹھٹھہ دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔''

ایک جگہ ناول کا کردار کہتا ہے، ''کوئی اخوند اگر اپنے مدرسے میں فارسی نہ پڑھاتا تو اس کا حشر ویسا ہی ہوتا جیسا آخوند صالح کا ہوا ہے، کوئی شاگرد اگر فارسی پڑھنے سے انکار کرتا تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی اور جو کوئی عزیز فارسی کی تعلیم سے بچنے کے لیے بچوں کو اٹھا لینا، اس کا سب مال و متاع، ضبط کرلیا جاتا تھا۔''

سندھی زبان کے ساتھ جو سلوک ون یونٹ کے زمانے میں ہو رہا تھا اور جس طرح سندھی عوام پر مادری زبان کی بجائے اردو تھوپی جارہی تھی کچھ ویسا ہی سلوک ترخانوں کے دور میں بھی ہوا تھا۔ چناں چہ صدیوں پرانی یہ تصویر اس منظر نامہ سے مختلف دکھائی نہیں دیتی ہے جس میں ماضی قریب کا سندھ سانسیں لے رہا تھا؟ اس میں کہیں کہیں جس بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے، وہ بھی دراصل عصری حالات کے پرتو کا نتیجہ تھی۔

سراج الحق میمن کی ناول ''پڑادو سوئی سڈ'' کے ساتھ ہی جس دوسری ناول کا خیال ذہن میں آتا ہے وہ آغا سلیم کا ناول ''اونداھی دھرتی روشن ہتھ'' ہے۔ اس ناول میں آغا سلیم نے 'سارنگ' کا جو کردار تخلیق کیا ہے وہ دراصل سندھ کی دھرتی پر زندگی جھوجھتا ہوا آج کا انسان ہے، بے کس و مجبور لیکن پرعزم اور حوصلہ مند۔ ناول میں سارنگ بار بار شکست، ناکامی اور حزیمت سے دوچار ہوتا ہے لیکن ہر بار ایک نئے عزم اور حوصلے سے زندگی کے عمل میں شریک ہوتا ہے اور ہر بار وہ ایک تاریخی شعور کی روشنی

Scanned by CamScanner

میں اپنی راہ تلاش کرتا ہے۔ ایک جگہ اس کا کردار کہتا ہے ''ساری دھرتی میرا دیس ہے، لیکن سندھ سے تو میری سانس کی ڈور بندھی ہے، سندھ تو وہ سرزمین ہے جس نے ہمیشہ پھول ہی پھول نچھاور کیے ہیں۔ خواہ اس کے بدلے میں اسے گالیوں اور گولیوں ہی سے کیوں نہ نوازا گیا ہو...'' آغا سلیم کا مذکورہ ناول بھی سندھیت کے ابلتے ہوئے جذبے اور سندھی تشخص کے احساس سے سرشار ہے۔

یہاں آغا سلیم کے ناول 'ہمہ اوست' کا ذکر بھی کیا جانا چاہیے، کہ یہ ناول آغا سلیم نے سندھ کے فکری پس منظر میں لکھا ہے اور سندھی معاشرہ میں تصوف کی کارفرمائی کو اجاگر کیا ہے۔ آغا سلیم کا یہ ناول موضوع اور پیشکش کے لحاظ سے نہایت سبک انداز اور نرم آثار ناول ہے۔ جس کے اثرات انتہائی گہرے اور وسیع ہیں ۔ اس میں سندھی ثقافت کے دھاروں کو انسانی رشتوں اور سلوک میں کارفرما ہوتے دکھایا گیا ہے۔ آغا سلیم کا ایک اور مختصر ناول (ناولٹ) 'روشنی کی تلاش' ہے۔ جو زباں و بیاں اور اظہار کی بنا پر سندھی کے منتخب ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں شہری معاشرے کا حال بیان کیا گیا ہے بلکہ شہروں میں چھوٹے چھوٹے فلیٹوں میں گزرتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول کا کردار نعیم اپنی یادداشت سے گزرے زمانوں اور لوگوں کا حال بیان کرتا ہے لیکن ایسے انداز میں کہ سب کچھ رواں تصویر کی صورت گزرتا چلا جاتا ہے، فلیش بیک تکنیک کو آغا سلیم نے نہایت خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ آغا سلیم کی ایک اور ناول ''ان پورو انسان'' (نامکمل انسان) ہے۔ اس میں سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات کے رہن سہن، افتادِ زندگی، طور طریقوں اور ذہنی و جذباتی رویوں کی صورت کشی کی گئی ہے مراعات یافتہ طبقات کی زندگی کے کھوکھلے پن اور خاندان کے درمیان باہمی تضادات اور تصادم کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ آغا سلیم کی مذکورہ بالا تینوں ناولوں یعنی 'روشنی جی تلاش'، 'تاریک دھرتی اور روشن ہاتھ' اور 'نامکمل انسان' گو جداگانہ ناول ہیں لیکن تینوں ناولوں کے درمیان ایک محسوس کن ربط وموجود ہے۔ ان میں بعض تلازم خیال اور واقعاتی مشابہتیں بھی موجود ہیں جن کی بنا پر تینوں کتابوں سے ایک قسم کی تاثراتی وحدت پیدا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تینوں کتابوں میں 'خیال کی رو' (stream of consciousness) کی کارفرمائی بھی نمایاں ہے۔

Scanned by CamScanner

۱۹۷۶ء میں عبدالرزاق راز کا ناول جو پہلے 'مسافر' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ 'نواں آدمی' کے نام سے دوبارہ چھپا۔ اس ناول میں بھی سندھیت کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔ دراصل عصرِ رواں ہی ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس میں سندھ پر حملہ آور ہونے والے ڈاکوؤں اور لٹیروں کا تذکرہ کیا گیا ہے، آریاؤں، عربوں، نادر شاہ، مغل لشکر اور پھر انگریز، یہ سب بیرونی لٹیرے باری باری موقع ملتے ہی سندھ پر چڑھ دوڑتے رہے ہیں اور سندھی عوام کو لوٹ مار اور بربریت سے بار بار تاراج کرتے رہے ہیں۔ ان حملہ آوروں کے مقابلے میں صف آرا ہونے والے سندھی بہادروں اور سورماؤں کے ذکر اذکار بھی ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں سندھی فکر، سندھی تہذیب، سندھی مفاد اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو تحفظ فراہم کیے تھے اور جن کے نام سندھ کی تاریخ میں سدا روشن رہیں گے۔ ان ہی سورماؤں میں شاہ عنایت شہید بھی تھے اور ہوش محمد شیدی بھی۔ اس ناول میں ایک کردار 'ساجن' بھی ہے جو ہر دور اور ہر عہد میں بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ جو گویا روحِ عصر کا نمائندہ کردار ہے۔ جیسے قرۃ العین حیدر کے ناول آگ کا دریا میں گوتم نیلمبر بار بار ہر زمانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ عبدالرزاق راز کا یہ ناول پانچ ہزار برسوں کے تہذیبی سفر کی روداد بھی ہے۔ مذکورہ ناول ایک اہم ڈائجسٹ میں بھی قسط وار شائع ہو چکا ہے اور اپنے دور میں قارئین کے وسیع حلقے میں مقبول رہا ہے۔

غلام نبی مغل کے ناول ''اوڑاھ'' (اوتھلا پانی) کا موضوع بھی سندھی قومیت اور سندھی تشخص کی تلاش ہے۔ اس ناول میں بھی تاریخی پس منظر میں سندھ پر ہونے والے مظالم کی تصویریں دکھائی گئی ہیں، خاص طور پر سندھی معاشرے کے درمیانی طبقے کی کس مپرسی کی داستان بیان کی گئی ہے اور ناول نگار اس بات کو بطور خاص دکھاتا ہے کہ ہر حملہ آور کس طرح درمیانے طبقے ہی کو اپنا نشانہ بناتا رہا ہے اور کس طرح سندھ کے شہروں کو تباہ و برباد کیا جاتا رہا ہے اور سندھی تہذیب کی علامات کس طرح مسمار ہوتی رہی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ون یونٹ کی صورت میں سندھ کے شہروں پر ہونے والے استحصال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرح غلام نبی مغل کا مذکورہ ناول بھی مزاحمتی/ احتجاجی ادب میں اہم مقام کا حامل ٹھہرتا ہے۔

امر جلیل کا معروف ناول 'نیٹ گونگی گالھ تی' (آخر گونگی بول پڑی) نہایت

Scanned by CamScanner

دلچسپ ناول ہے جس میں امر جلیل اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں معاشرتی حالات کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ امر جلیل اپنی طرز کے مختلف فن کار ہیں اور ان کے ادب میں معاشرتی صورتِ حال اور معروضی مناظر کی کارفرمائی نمایاں رہی ہے۔ سندھی ادب کی مزاحمتی تحریک میں امر جلیل کا حصہ نمایاں رہا ہے جن پر تفصیلی اظہارِ خیال مناسب مقام پر ہوگا۔

موہن جو دڑو کے آثار قدیمہ کی دریافت نے سندھی قومیت کو ایک نئے احساس تفخر سے سرفراز کیا ہے۔ چناں چہ موہن جو دڑو کی تہذیب تخلیقی ادب کا سرچشمہ بھی ثابت ہوئی ہے اور اس کے پس منظر میں متعدد نظمیں، افسانے، ناول اور ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ علی بابا کا ناول ''موئن جو دڑو'' جو ماہنامہ نیئن زندگی میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس طرح عابد لغاری کا ناول ''زندہ لاش کا سفر'' بھی موہنجو دڑو کے ثقافتی پس منظر میں لکھا گیا ہے'' اور سندھ کی تہذیبی شناخت کے موضوع کو ابھارتا ہے۔

قاضی فیض محمد کی دلچسپ فن تاسی Fantasy باویھ سوباویھ (۲۲۲۲) سندھی فکشن میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس میں قاضی فیض محمد نے دو ڈھائی سو سال بعد پیش ہونے والی زندگی کا پیرایہ اظہار اور اردگرد ماحول کا تصوراتی نقشہ کھینچ دکھایا ہے فن تاسی لکھنے کا فن تاریخی ناول لکھنے کے فن سے کہیں زیادہ مشکل اور نازک ہوا کرتا ہے کہ تاریخی ناول لکھنے والے کے پاؤں ٹھوس زمین پر ٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کی گرفت عموماً مضبوط مادی شواہد پر ہوا کرتی ہے لیکن فن تاسی لکھنے والا امکانات کی اندھی سرنگ میں سفر کر رہا ہوتا ہے اور اس کا سارا دار و مدار تخیل کے بہتے دھاروں پر ہوا کرتا ہے۔ اس نوع کی فن تاسی انگریزی میں مشہور مصنف جارج آرویل نے انیس سو چوراسی (۱۹۸۴ء) کے نام سے کم و بیش پچاس سال قبل یعنی ۱۹۴۸ء میں لکھی تھی اور اردو میں محمد خالد اختر نے بیس سو گیارہ، سن انیس سو ساٹھ (۱۹۶۰ء) کی دہائی میں تحریر کی تھی۔ قاضی فیض محمد نے اپنے تخیل کے زور پر آنے والے وقت کے خاکے دکھائے ہیں جو سندھی ادب میں ایک ندرت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

منیر احمد مانک کے ناول ''رج ء پڑاڈ'' (سراب اور بازگشت)، ''پاتال میں

بغاوت''، ''لڑھندڑ نسل'' (بھٹکتی نسل) اور ''ساھ ماٹ میں'' جداگانہ مزاج اور تناظر کی ناول ہیں، منیر احمد مانک جدیدیت کی تحریک میں صفِ اوّل کا لکھنے والا تھا۔ اس نے سندھی معاشرے میں فرد کی بے بسی کی تصویریں کھینچی ہیں لیکن اپنے آپ کو سندھ کی معروضی صورتِ حال سے بھی وابستہ رکھا ہے، اسی لیے اس کی تخلیقات ان عیوب سے محفوظ رہی ہیں جو بالعموم جدیدیت کے لکھنے والوں کی تحریروں میں آجاتی ہے یعنی مغائرت اور شکست خوردگی، بے شک منیر احمد مانک بے جا خوش فہمی کا بھی شکار نہیں ہے اور عام طور پر تصویر کے تاریک پہلو بھی اس کی نظر میں رہتے ہیں۔ وہ حقیقی تصویر کی بجائے محض اپنی تخیل کی فضا میں پرواز نہیں کرتا۔ منیر احمد مانک کی ناول ''ساھ ماٹ میں'' ایسی حقیقت پسندانہ ناول ہے جس میں مانک نے مارشل لا کے دور میں سندھی عوام کی بے بسی اور لاچارگی کی تصویر کھینچ دکھائی ہے۔ پی این اے کی تحریک، مارشل لا اور عام لوگوں کی مایوسی اور محرومی کا احساسِ شدید اس ناول کے موضوع ہیں۔ یہ ناول اپنی تلخ نوائی اور حقیقت پسندی کی وجہ سے مارشل لا کے دور میں پاکستان میں نہیں چھپ سکا تھا۔ چناں چہ اس کا پہلا ایڈیشن بھارت ہی میں چھپا تھا اور دوسرا ایڈیشن پاکستان کے جمہوری دور میں چھپ سکا تھا۔

ادھر جدید ٹیکنالوجی کے اثرات بھی ادبی تخلیق کے عمل پر اثرانداز ہو رہے ہیں چناں چہ یاسین بروہی نے ''نارنجی کیلا ۲۰۳۰ء'' کے نام سے جو ناولٹ لکھا ہے اسے بھی نئے انداز کی فن تاسی کہنا چاہیے۔ ان کے علاوہ بلال مسرور بدوی کی ناول ''رانی''، تسلیم ممتاز کی ناول ''روشنی جو گولا''، طارق عالم کی ناول ''رھجی ویل منظر'' (باقی رہ جانے والا منظر) بھی اہم ناول ہیں جو اس جدید دور میں لکھے گئے ہیں۔ اور جن میں جدید طرزِ احساس اور نئے رجحانات کا اظہار ملتا ہے۔

ڈراما نگاری کا منظرنامہ

قیامِ پاکستان سے قبل سندھ کے معاشرتی ماحول میں ڈرامہ نگاری نسبتاً عروج پر رہی ہے۔ ڈرامہ نگاری کا فروغ دراصل مشروط ہوتا ہے، اسٹیج، تھیٹر اور ڈرامیٹک سرگرمیوں سے، وہ دور ایسا تھا کہ اس میں جگہ جگہ ڈرامیٹک کلب، سوسائٹیاں، ناٹک منڈل،

Scanned by CamScanner

ناٹک ساہتیہ اور ایسی جماعتیں قائم تھیں جو ڈرامے سننے، ڈرامے دیکھنے اور ڈرامے کھیلنے میں بطور خاص دلچسپی لیتی تھیں، چناں چہ اس دور میں تمثیل نگاری بھی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ ڈرامے لکھتے اور رسائل و جرائد میں ان کی اشاعت بھی ہوتی تھی۔ انگریزی، بنگالی، مرہٹی اور اردو ڈراموں اور تمثیلوں کے تراجم کا سرسبز دور بھی گزر چکا ہے۔ اس وقت مرزا قلیچ بیگ، ایم یو ملکانی، خان چند دریانی، جٹھ مل پرسرام، بھیرومل مہر چند، مرزا نادر بیگ، لیکھ راج عزیز، عثمان علی انصاری، آسونند مامتو رائے کشن چند بیوس، محمد عثمان ڈیپلائی، آغا غلام نبی صوفی، محمد اسماعیل عرسانی، احمد چھاگلہ وغیرہ کے لکھے ہوئے ڈرامے اور تھیٹر بالعموم پسند کیے جاتے تھے۔ ان میں طبع زاد تمثیلیں بھی تھیں اور ترجمہ کیے ہوئے ڈرامے بھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ تمثیل آشنا ماحول ہی ختم ہو گیا۔ ہندوؤں کے نزدیک ڈرامے کا ایک مذہبی اور معاشرتی تصور بھی تھا۔ جب کہ مسلمان بالعموم تھیٹر کو زیادہ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور نام نہاد اخلاق پسندیت کے نام پے محراب و منبر اور خود ساختہ سماج کے ٹھیکے دار اسٹیج اور ناٹک کے خلاف زہر اگلنے پر ہمیشہ مامور رہتے آئے ہیں۔ چناں چہ ہندوؤں کی ہجرت نے جہاں ادب کی دیگر اصناف کو نقصان پہنچایا وہیں سندھی ڈرامہ نگاری کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا اور مدتوں سندھ میں ڈرامہ، تھیٹر اور تمثیل نگاری کا کام شجرِ ممنوعہ ہو کر رہ گیا اور وہ فضا دوبارہ بحال ہی نہ ہو پائی جو قیامِ پاکستان سے قبل یہاں موجود تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد محمد عثمان ڈیپلائی کام دم غنیمت تھا جنھوں نے سندھی ڈرامہ نگاری کے کام کو جاری رکھا۔ ان کے مشہور ڈراموں میں ''نور جہاں جو پت''، ''سجائی موڑی''، ''کانگریسی جار''، ''شاھدی نجومی اور کورٹ'' وغیرہ شامل رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد محمد اسماعیل عرسانی کے ڈراموں کا مجموعہ ''ڈزن ڈائیلاگ'' اور ''حسن پروین'' شائع ہوئے تھے۔

لطف اللہ بدوی کا لکھا ہوا ڈرامہ ''دودو چنیسر'' جو شاہ لطیف بھٹائی کی داستان پر مبنی ہے، خاص طور پر مقبول تھا۔ شیخ ایاز نے ''دو دو کی موت'' کے عنوان سے منظوم ڈراما لکھا تھا جو اپنے دور میں کالجوں کے ڈرامیٹک کلب اور سوسائٹیوں میں مقبول تھا اور اسے جگہ جگہ اسٹیج کیا جاتا رہا ہے۔ عبدالرزاق راز نے محمد بن قاسم پر ''فاتح سندھ'' کے نام

Scanned by CamScanner

سے ڈرامہ لکھا جو ایک خاص حلقے میں مقبول ہوا۔

ابتدائی دور میں چنہ شہر ناز کے دو مکمل ڈرامے ''سچا بیج پلنگ'' اور ''دریا خان'' عموماً پسند کیے گئے۔ مراد علی مرزا نے عربی زبان میں لکھے ہوئے ڈرامے کو سندھی میں ''موہنجھارو'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کے بعد علی بابا کا لکھا ہوا ڈرامہ 'ڈنگی منجھ دریا' رشید بھٹی کا ڈرامہ ''عاشق زہر پیاک'' محمد ہاشم رہبر کا ''سندباد سیلانی'' شمشیر الحیدری کا ''کاک محل'' ایاز عالم ابڑو کا ''ڈات جی ڈیھ میں''، اللہ بخش تالپور کا ''عجیب شادی''، جی این قاضی کا ''شہنشاہ اکبر'' حبیب بخاری کا ''قلوپطرہ'' تھے، اس کے علاوہ حبیب اللہ مرزا نے شیکسپیئر کے ڈرامے ''میکبتھ'' کا ترجمہ پیش کیا۔ رسول بخش خمار کا ڈرامہ پاچا پتھرلاء۔ ادھر رشید احمد لاشاری نے ہندی کے مشہور ڈرامے ''شکنتلا'' اور ''نل دمینتی'' کے ترجمے کیے۔ ظہور انصاری نے ''جن جو ناگڑھ جلایو'' (جنھوں نے جوناگڑھ کو آگ لگائی) وغیرہ شائع کیے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد تمثیل نگاری کا ماحول دوبارہ میسر نہ آسکا۔ اسٹیج اور تھیٹر کی سہولتیں دن بہ دن معدوم ہوتی چلی گئیں۔ ڈرامہ، تھیٹر اور اسٹیج دیکھنے والے شائقین ناپید ہوتے گئے۔ چناں چہ ڈرامہ لکھنے اور چھاپنے والے بھی کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ لیکن ظاہر ہے جب ایک راستہ بند ہوتا ہے تو زندگی اپنے اظہار کے لیے کسی اور راستے کا انتخاب کر لیتی ہے۔ چناں چہ اسٹیج کے زوال نے ریڈیو تمثیل اور ریڈیو ڈرامے کو ترقی دی جو سندھی زبان میں بالکل نئی چیز تھی۔

۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان کراچی سے سندھی زبان کے پروگرام شروع ہوئے تو اس میں سندھی تقریروں، فیچر اور سندھی موسیقی کے ساتھ ساتھ سندھی ڈرامے اور تمثیل پیش کرنے کی گنجائش بھی نکالی گئی۔ ابتدائی دور میں امام بخش نیاز، حبیب اللہ فکری، اور عبدالکریم شاد، خدیجہ چھاگلہ اور عبداللطیف عباسی نے سندھی میں ریڈیائی تمثیلیں لکھیں، اسی دور میں خدیجہ چھاگلہ اور حبیب اللہ فکری نے قدیم لوک داستانوں کو بھی ڈرامائی تشکیل دیں جن میں عمر ماروی اور نوری جام تماچی بطور خاص مقبول ہوئیں۔ لیکن سندھی میں ریڈیائی ڈراموں اور صداکاری کی بنیاد ڈالنے کا سہرا علی احمد چھاگلہ اور ایم بی انصاری کے سر رہا ہے۔ ابتدا میں سندھی ڈراموں کا دورانیہ صرف آدھ گھنٹے کا ہوا کرتا تھا۔

Scanned by CamScanner

۱۹۵۰ء ہی میں جب حیدرآباد اسٹیشن کا افتتاح ہوا تو وہاں سے طویل دورانیے کے سندھی ڈرامے بھی نشر کیے گئے۔ اس سلسلے میں منظور نقوی نے پہلا سندھی ڈرامہ ''روٹی'' لکھا جو اردو سے ماخوذ تھا۔ منظور نقوی سندھی ریڈیو ڈرامہ نگاری میں ایک اہم نام کے طور پر ابھرے تھے۔ جس نے کئی طویل اور مختصر دورانیے کے ڈرامے، تمثیلیں اور فیچر حیدرآباد ریڈیو کے لیے لکھے، ان کا لکھا ہوا ڈرامہ ''جیارو بت'' (زندہ بت) بہت مقبول ہوا تھا۔

منظور نقوی کے علاوہ زیب ماتلی کے ڈرامے مہندی رتا ہتھ (مہندی لگے ہاتھ) اور ''ستارہ'' ایسے ڈرامے ہیں جو بار بار نشر کیے گئے۔ ان میں ''ستارہ'' پہلا سندھی ڈرامہ تھا جو نظم معریٰ میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد کے دور میں ابن الیاس سومرو، مراد علی مرزا، ممتاز مرزا، آغا سلیم، امر جلیل، علی بابا، شمشیر الحیدری، شوکت شورو شمر چنہ، قاضی خادم، ڈاکٹر محمود یوسف پنھور وغیرہ کے نام شامل ہیں جنھوں نے سندھی معاشرت، تاریخ، ثقافت اور روزمرہ کے واقعات پر بہت پُراثر ڈرامے لکھے تھے۔ ممتاز مرزا کی ڈرامائی تمثیل ''سورج مکھی'' اور ''آخری رات'' آغا سلیم کے ڈرامے ''روپ سروپ'' قاضی خادم کے ڈرامے ''لڑک لڑک زنجیر'' بطور خاص مقبول ہوئے۔

سندھ میں ٹیلی وژن کے آغاز کے بعد سندھی زبان میں ٹیلی وژن کے لیے بھی ڈرامے لکھے گئے جو سندھی و غیر سندھی ناظرین میں بھی مقبول ہوئے۔ اس سلسلے میں عبدالکریم بلوچ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے کہ ٹیلی وژن سے نشر ہونے والے ڈراموں میں سب سے پہلے شمشیر الحیدری نے مرزا قلیچ بیگ کے مشہور ناول ''زینت'' کو بنیاد بنا کر سندھی کھیل لکھا جو تین قسطوں میں پیش کیا گیا۔ دوسرا کھیل علی بابا نے ''ھی جیوں ھی سپنا'' (یہ جیون یہ سپنے) پیش کیا۔

امر جلیل کا ڈرامہ ''اوندھ ۽ روشنی'' (اندھیرا اور روشنی) اور ''مٹی جا ماٹھو'' (مٹی کے آدمی) آغا سلیم کا ڈرامہ ''خواب جو سورج'' (خواب کا سورج)، ''پرہ جا مسافر'' (پو پھٹے کے مسافر)، پوہاڑی جا پاچا (پچھلے پہر کی پرچھائیاں) وغیرہ مقبول ہوئے۔

ٹی وی ڈرامہ نگاری ایک مختلف میدان ہے اور اس ڈرامے کی مقبولیت میں لکھنے والے کی کاوش کے علاوہ اداکاری، صداکاری، گلیمر اور پروڈکشن کے مختلف عناصر

Scanned by CamScanner

ہیں جو کامیابی کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ ان ڈراموں کی ادبی حیثیت غالباً ابھی متعین ہونی ہے کیوں کہ ان ڈراموں کی عام طور پر کتابی صورت میں اشاعت نہیں ہوا کرتی اس لیے انھیں ادبی ڈرامے کی صنف میں شامل کرنے میں شاید تامل کیا جائے گا۔

ٹیلی وژن کے ڈرامہ نگاروں میں علی بابا، آغا سلیم، عبدالکریم بلوچ، شمشیر الحیدری، عبدالقادر جونیجو، مراد علی مرزا، نور الہدیٰ شاہ، ابنِ حیات، امر جلیل، قاضی خادم، منظور قریشی، امداد حسینی، زربینہ بلوچ، عبدالحق ابڑو، ممتاز مرزا، رزاق مہر، عنایت میمن، بیدل مسرور، آغا رفیق، طارق عالم ابڑو، محمد خاں جمانی، غالب لطیف وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاتے ہیں۔ علی بابا کے معروف ڈرامے ''ڈنگی منجھ دریا'' کو پاکستان کی جملہ زبانوں کے منتخب ڈراموں میں اوّل نمبر مل چکا ہے اور اسے بین الاقوامی ثقافتی میلے کے مقابلے میں بھی شریک کیا گیا ہے۔ عبدالقادر جونیجو کی تمثیل ''رانی جی کہانی'' اتنی مقبول ہوئی کہ اسے اردو میں ''دیواریں'' کے نام سے قومی رابطے پر متعدد بار پیش کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح نور الہدیٰ شاہ کا مقبولِ عام ڈراما ''جنگل'' اردو میں جنگل کے نام سے اپنی مقبولیت قائم کر چکا ہے۔ آج سندھی ٹی وی ڈرامے اپنی حقیقت نگاری اور عام دیہی منظرنگاری کی وجہ سے بلاتخصیصِ زبان پاکستان کے ٹی وی ناظرین میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔

کتابیات

۱۔ Dr. Ghulam Ali Alana، An Introduction of Sindhi Literature
Sindhi Adabi Board, Jamshoro

۲۔ Prof. (Miss) Popat. R. Hiranandani، History of Sindhi Literature

۳۔ سندھی نثر جی تاریخ (سندھی) پروفیسر منگھا رام ملکانی، روشنی پبلی کیشن، حیدرآباد

۴۔ سندھی زبان و ادب کی مختصر تاریخ (اردو)، پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی، مقتدرہ قومی زبان

۵۔ آزادی کے بعد سندھی افسانے کی رفتار (سندھی) شمس الدین عرسانی، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو

Scanned by CamScanner

۶۔ سندھی ناول جی ارتقائی تاریخ (سندھی) ڈاکٹر غلام حسین پٹھان، انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی، جام شورو
۷۔ سندھی ادب کا فکر پس منظر (سندھی) ڈاکٹر غفور میمن، شاہ لطیف چنہ، کراچی یونی ورسٹی
۸۔ سندھی کہانی کی رفتار... مختصر جائزہ (سندھی) ممتاز مہر
۹۔ سندھی ڈرامے کی صدی، آغا خالد سلیم، ادارۂ ثقافتِ پاکستان، کراچی
۱۰۔ چہار مقالہ (سندھی) محمد اسماعیل عرسانی
۱۱۔ رسالہ 'مہران'، رسالہ 'روح رہان'، رسالہ 'سوہنی'، رسالہ 'سوجھرو' کے فائل۔
۱۲۔ متعدد اہم افسانوی مجموعے، ناول، ڈرامے جن کا تذکرہ ہوا۔

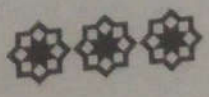

Scanned by CamScanner